ناشر:- مولانا عبد الماجد دریابادی اکاڈمی (رجسٹرڈ)

مُرتّب

حکیم عبد القوی دریابادی بی۔ اے

ناشر:- مولانا عبد الماجد دریابادی اکاڈمی (رجسٹرڈ)

مُرتّب

حکیم عبد القوی دریابادی بی۔اے

ناشر : مولانا عبدالماجد دریابادی اکادمی

ہیڈ آفس ۸۵ کچہری روڈ لکھنؤ

طابع : نیو یونائٹیڈ انڈیا پریس ۲۶ گوئن روڈ لکھنؤ

بار اول : دسمبر ۱۹۸۰ء

تعداد : گیارہ سو

قیمت : پندرہ روپے ۱۵

ملنے کا پتہ

(۱) صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ

(۲) مولانا عبدالماجد اکاڈمی ۔ کچہری روڈ لکھنؤ

(الف)

فہرست مضامین

صفحہ

(۵)

ڈاکٹر و طبیب

(۶)

دیگر حضرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتّب

مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے تعزیتی مقالے اور شذرے، سچ، صدق اور صدق جدید میں صدہا کی تعداد میں نکلے۔ ان میں سے صرف ۶۲ منتخب کرکے اس مجموعہ میں شائع کئے جارہے ہیں۔ پہلا بڑا تعزیتی مضمون مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم پر ہے اور آخری تعزیتی مضمون ایک دوسرے ندوی نگرامی مولانا محمد ادلیس پر۔ ندوۃ العلماء سے مولانا کا جو خصوصی تعلق تھا وہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انشاء ماجدی کے جوہر اور موضوعوں کی طرح ان تعزیتی مضامین میں بھی خوب نمایاں ہیں اور ان میں وہ ایک صاحبِ طرز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان میں بعض مضامین مولانا کے اخبار میں شائع ہونے کے بعد دوسرے اخباروں میں کثرت سے نقل ہوچکے ہیں۔

مولانا کی بعض تالیفات کی طرح اس مجموعہ کے بھی دو نام رکھے گئے ہیں، وَفَیات ماجدی۔ نثری مرثیے۔

مولانا کی یادگار میں قائم ہونے والی عبدالماجد اکاڈمی، مرحوم کی تصانیف کی اشاعت کا آغاز اسی کتاب سے کر رہی ہے اس کے بعد انشاء اللہ ان کی دوسری تالیفات (خصوصاً سچ اور صدق کے منتخب مضامین مختلف عنوانات کے تحت) بھی رفتہ رفتہ شائع ہوتی رہیں گی۔

حکیم عبدالقوی دریابادی

۲۶ نومبر ۱۹۷۸ء

تعزیت نگار کی تعزیت

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعزیتی مکتوب

قدوائی صاحب سلام مسنون!

کل اخبار میں مولانا عبدالماجد صاحب مرحوم و مغفور کے سانحۂ رحلت کی خبر پڑھی، مرحوم کی وفات سے کیسی وہ طویل قیمتی اور نوع بہ نوع خدمات کی یاد تازہ ہو گئی جن پر مرحوم کی گرانقدر شخصیت اثر انداز رہی تھی، مذہب اور اخلاق، ادب، تنقید، معاشرت و صحافت کی کون سی وادیاں نہ تھیں جن سے مرحوم خوش فکری، خاموشی سنجیدگی اور قابلیت سے نہیں گزر چکے تھے۔ گزشتہ نصف صدی سے اوپر مرحوم کو جو طویل اور زرّیں زمانہ ہمارے نواح کی جیسی جلیل و عظیم شخصیتوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ملا وہ شاید اب کسی کو نصیب نہ ہو۔ وہ ایک نشانِ منزل تھے جس کو انھوں نے ہمارے علم و دانش اور تہذیب و ثقافت کے راستہ میں بہت دور تک لاکر نصب کر دیا تھا۔ مرحوم کی علمی، مذہبی، ادبی اور اخلاقی خدمات کی تفصیل پیش کرنا ابھی تو کیا بہت دنوں تک ناممکن رہے گا۔ مرحوم و مغفور اب وہاں پہونچ چکے ہیں جہاں ان کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے ساتھ ہے لیکن ہماری ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں ہے کہ مرحوم کی دینوی خدمات کا تفصیلی اور بطریق احسن جائزہ لیں تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کی رہبری اور ہمت افزائی میں معاون ہو۔ یہ سطور لکھ رہا تھا کہ محسوس ہوا کہ جیسے دریا باد نارکی اعتبار سے جیسا کچھ ہو اب مرحوم ہی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے! یہ امتیاز اس صدی میں اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصہ میں شاید ہی آیا ہو۔!
اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

آپ کے غم میں شریک
رشید احمد صدیقی

بنام ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ۔۔۔۔۔۔ ۸ر جنوری ۱۹۷۷ء

مولینا عبدالماجد دریابادی مرحوم

حیات و خدمات ایک نظر میں

ولادت ۱۸۹۲ء — وفات ۱۹۷۷ء

۱:-	مارچ ۱۸۹۲ء	ولادت بمقام دریاباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)
۲:-	۱۹۱۲ء	کیننگ کالج لکھنؤ (اب یونی ورسٹی) سے بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا
۳:-	۱۹۱۶ء	باندہ میں شیخ یوسف الزماں کی دختر سے عقد ہوا
۴:-	۱۹۱۷ء	انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن سے شائع ہوئی
۵:-	۱۹۱۸ء	الحاد سے مذہب کی طرف واپسی شروع ہوئی
۶:-	۱۹۱۸ء	دارالترجمہ حیدرآباد میں ملازمت شروع کی۔
۷:-	۱۹۱۹ء	نظام حیدرآباد کے یہاں باریابی ہوئی اور علمی بخشش منظور ہوئی جو تاحیات ملتی رہی۔
۸:-	۱۹۲۵ء	ہفتہ وار سچ لکھنؤ سے جاری کیا
۹:-	۱۹۲۵ء	صوبہ خلافت کمیٹی اودھ کے صدر منتخب ہوئے
۱۰:-	۱۹۲۹ء	حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ سفر کے حالات اپنے مخصوص انداز میں سفر حجاز کے عنوان سے لکھے جو آج بھی زائر حرم کے لئے ایک مفید تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے
۱۱:-	۱۹۳۳ء	انگریزی ترجمہ قرآن مجید کی مشغولیت کے باعث سچ کو بند کرنا پڑا
۱۲:-	۱۹۳۵ء	صدق ہفتہ وار جاری کیا
۱۳:-	۱۹۴۱ء	انگریزی ترجمہ تفسیر کا پہلا پارہ تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا

۱۴:- سنہ ۱۹۵۰ء صدق کے بجائے ہفتہ وار صدق جدید کا لنا شروع کیا

۱۵:- سنہ ۱۹۵۱ء دار المصنفین اعظم گڑھ کی مجلس عاملہ کے صدر منتخب ہوئے

۱۶:- سنہ ۱۹۵۴ء ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر پاکستان تشریف لے گئے۔ ڈھائی ہفتہ پاکستان میں کے عنوان سے اپنے مخصوص انداز میں وہاں کے حالات لکھے۔

۱۷:- سنہ ۱۹۵۸ء (لاہور، پاکستان) میں منعقدہ اسلامی مذاکرہ میں ہندوستانی وفد میں گئے

۱۸:- سنہ ۱۹۶۲ء حکومت یو۔ پی نے قابل قدر تصانیف کی بنا پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔

۱۹:- سنہ ۱۹۶۶ء حکومت ہند کی طرف سے عربی میں فضیلت کی سند ملی

۲۰:- سنہ ۱۹۶۷ء جناب رادھا کرشنن صاحب صدر جمہوریہ نے یہ سند راشٹرپتی بھون میں عطا کی

۲۱:- سنہ ۱۹۷۴ء فالج کا پہلا حملہ دریاباد میں ہوا۔

۲۲:- سنہ ۱۹۷۶ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کانوکیشن میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم نے عطا کی۔

۲۳:- سنہ ۱۹۷۷ء ۶ جنوری سنہ ۱۹۷۷ء اپنی قیام گاہ خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ میں صبح سوا چار بجے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ایک نماز جنازہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی کی اقتداء میں بہت بڑے مجمع نے پڑھی۔ اور دوسری نماز جنازہ آبائی وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں حافظ غلام نبی (مرحوم) کی اقتدا میں بعد نماز مغرب پڑھی گئی جس میں قصبہ کے اور جوار کے لوگ بہت بڑی تعداد میں شریک تھے۔ تدفین آبائی مکان نزد مخدوم زادگان کے پیچھے درگاہ حضرت مخدوم آبکش میں عمل میں آئی۔

ماں کے قدموں پر

●

ماہ مبارک ربیع الاول کی پندرھویں ہے اور اپریل کی تیرھویں۔ اتوار کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور شب دوشنبہ شروع ہونے کو۔ وطن سے دور پردیس میں ایک اللہ کی بندی پر عالم نزع طاری ہے۔ لڑکی لڑکوں، پوتے پوتیوں کا حلقہ، زبانوں پر اللہ کا نام، اللہ کا کلام اور توحید کا کلمہ، ادھر آفتاب غروب ہوا ادھر وہ روح پاک کی ۸۵ سے زائد منزلیں طے کئے اپنے مالک کے حضور میں پہنچ گئی ـــ میری جنت اپنی کے قدموں کے نیچے تھی۔ خوش نصیب تھا میں کہ اتنے عرصہ خدمت کا موقع پایا، بد نصیب

منقول از صدق ۱۸ اپریل ۱۹۴۱ء جلد ۷ نمبر ۴

ہوئی ہیں کہ۔ قدر اس نعمت کی ایک دن بھی نہ کی اور جو سب سے زیادہ مستحق تھی خدمت کی
اس کی خدمت کا حق ایک بار بھی ادا نہ کیا! حادثہ سخت اور اپنی محرومی و بدنصیبی اس سے سخت تر

نماز کی پابندی کا نہیں نماز کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ اس دور کے اکابرین میں بس چند
ہی مثالیں ایسی ملیں گی، اشراق، چاشت، تہجد کا وہ اہتمام کہ ہم لوگوں کو شاید فرض ہی کے لئے
نصیب ہوتا ہو۔ بے سن و سال اور تہجد کا یہ التزام کہ کسی موسم میں بھی ناغہ نہ ہونے پائے۔ گرمیوں
کی یہ مختصر راتیں صبح تک بھی نیند پوری ہونی مشکل، ابھی پڑیں اور تہجد کیلئے ابھی اٹھ بیٹھیں، چلے کے جاڑے
پڑ رہے ہیں، فجر کے وقت بھی لحاف کے اندر سے نکلنا دشوار، رات کے ایک بجے، دو بجے اور
تین بجے تہجد کے لئے وضو کر رہی ہیں۔ عزیزوں میں کوئی پردیس سے آیا، کوئی بیماری سے
اچھا ہوا، غرض کسی قسم کی بھی خوشی ہوئی اور انھیں نماز شکر ادا کرنے کا گویا حیلہ ہاتھ آگیا۔ عزیزے
ملیں گی بعد میں نماز کو پہلے کھڑی ہو جائیں گی۔ کسی کے انتقال کی خبر سنی اور ایصال
ثواب کے لئے نماز کیلئے ہاتھ باندھ لئے، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک جتنی رکعتیں پڑھ ڈالتیں
ان کا علم تو بس اللہ کے فرشتوں ہی کو ہوگا۔

محلہ کی، شہر کی جو عورتیں ملنے آتیں ان پر تبلیغ نماز کی کیا کرتیں، خدا جانے کتنوں
کو نمازن ہی نہیں تہجد گزار بنا دیا۔ نماز ہی کا سا عشق اذان کے ساتھ تھا۔ پردیس میں مکان اگر
ایسا مل جاتا جہاں اذان کی آواز آتی ہو تو باغ باغ ہو جاتیں۔ وطن میں رہتیں تو گھر کے
صحن اور ڈیوڑھی میں برابر اذان دلایا کرتیں۔ کئی سال قبل سے کہہ رہی تھیں کہ مرنے کے
بعد یہ جی چاہتا ہے کہ مسجد کے عین دروازے پر دفن ہوں کہ اللہ کے گھر آنے جانے والے میرے
اوپر سے گزرتے رہیں، خیر یہ ناممکن ہو تو میری قبر مسجد سے متصل ہی بنے کہ اذان کی آواز
برابر آتی رہے۔

نماز و اذان کے بعد نمبر روزہ کا تھا۔ عمر ستر کی ہوئی اور پھر اسّی کی یہاں

کہ بچاسی گزر گئی اور فرض روزہ تو کیا چھوٹنے پاتا۔ عاشورہ محرم اور عرفہ ذی الحجہ اور
پندرھویں شعبان کے روزے موسم کوئی سا بھی ہو ترک نہ ہونے پائے۔ جوان ہمت و عزیمت
کی یہ مثالیں دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ حج اپنے شوہر مرحوم کے ساتھ ۱۹۱۲ء میں کر آئی تھیں اور کفن
کا کپڑا آب زم زم سے دھلا ہوا اسی وقت سے سفر و حضر میں ساتھ رکھنے لگی تھیں دوبارہ
حج و زیارت مدینہ کی تمنا عمر بھر رفیق رہی نماز کی طرح ادائے حج کی تبلیغ بھی پاس بیٹھنے والوں
کو کیا کرتیں۔ خیر و خیرات داد و دہش کی تو کہنا چاہئے کہ حد ہی نہ تھی، ہم لوگوں کے بچپن میں بارہا
یہ ہوا کہ گھر میں مٹھائی یا موسمی پھل بہت سے آئے اور ہم خوش ہوئے کہ کئی دن تک کھائیں۔
ذرا دیر میں دیکھا کہ سب تقسیم ہو چکے ہیں۔ اب بڑھاپے میں دیکھا کہ دسترخوان پر کوئی مخصوص
چیز ان بڑی بی کی خاطر آئی انھوں نے جھٹ اٹھا کر دوسروں کو بھجوا دی۔

اُردو کی شدبد معمولی سی تھی وہ بھی اب بھول بھال گئی تھیں۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی
تھیں زیادہ رواں وہ بھی نہ تھا اور اب ضعف بصارت کی بنا پر اور زیادہ اٹکنے لگیں تھیں
لیکن ہمت میں ذرا فرق نہیں، ذوق شوق وہی دھن، جلی حرف کا قرآن لے کر بعد اشراق
بیٹھ جاتیں ایک ایک سطر نکالنے میں ایک منٹ لگ جاتا اپنی ہار بھلا کہاں مانتیں، مذہبی
کتابیں آخر عمر میں اپنی پوتیوں سے پڑھ کر سنتیں۔ قویٰ بجز شدید گراں گوشی کے عام طور
پر آخر تک اچھے رہے، بے تکلف چلتی پھرتیں، کوٹھے پر چڑھتی اُترتیں، دعا بھی اسی کی کیا
کرتیں کہ یا اللہ ہاتھ پیر آخر وقت تک جواب نہ دیں، ہاتھ میں ذائقہ تھا، کھانے کی مخصوص
چیزیں کچھ روز پیشتر تک اپنے ہاتھ سے پکاتی رہیں اور عینک لگا کر سیتی پروتیں، کپڑے
اپنے ہاتھ سے قطع گویا بالکل آخر تک کرتی رہیں۔

ادھر کئی سال سے اکثر اسی موسم میں بیمار نزلہ و بخار میں ہو جاتیں اور چند روز بعد
اچھی ہو جاتیں اب کی بھی یہی دھوکا رہا خیال سن کی طرف گیا ضرور لیکن جواب نفس نے یہ
سمجھا دیا کہ ان کا سن تو ابھی پھر بھی کم ہے ان کی ایک بڑی بہن کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی تھی

اور ان کی والدہ کی تو اس سے بھی زائد اور پھر معالجین کا اطمینان مستزاد ! غرض کہ پردے پر پردے غفلت کے آنکھوں پر پڑے رہے۔ اور ساعت موعود تو جب بھی آتی ہے ایسی ہی دبے پاؤں اور زیر نقاب آتی ہے! آہ نادان انسان اور اس کے غلط اندازے۔!

"بھیا اب سورہ یٰسین پڑھ دو" یہ آخری الفاظ تھے جو اس چاہنے والی ناز اٹھانے والی ہستی کی زبان سے میں نے سنے ہائے کیا معلوم تھا کہ اب اس کے بعد کوئی اور پوری بات اس محبت والی زبان اور شفقت والے ہونٹوں سے سننا مجھ کم نصیب کے نصیب میں نہیں!

تعمیل ارشاد میں سورۂ یٰسین ایک بار نہیں دو بار پڑھ کر دم کردی عارضی سکون ہوا چہرہ پر بحالی آئی لیکن زبان ساتھ نہ دے سکی، نماز، وضو، تیمم کی فرمائش ادھ کٹے لفظوں کے ساتھ ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ برابر جاری۔ ہاتھ اٹھاتی ہیں کانوں تک لے جاتی ہیں پھر سینے تک لے آتی ہیں گویا نماز پڑھے چلی جاتی ہیں! ـــــ اللہ کے کلام والذین ہم فی صلاتہم دائمون کی تفسیر کتابوں اور روایتوں کی مدد کے بغیر ایک نئے رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے۔

اللہ کی بندی کا سابقہ اپنے مولیٰ سے تھا بیٹے اور پوتے پاس کھڑے پکار رہے ہیں اور کوئی جواب نہیں ملتا! یا اللہ اتنی بے رخی تو زندگی میں کبھی نہیں دیکھی! چہرہ دھلے کپڑے کی طرح یک لخت سفید خون کی چھینٹ نام کو نہیں بس نور ہی نور بحالت منٹ منٹ پر کچھ سے کچھ ہونے لگی! تنفس تیز سے تیز تر ہو گیا! نبض کا نظام بگڑ گیا! آنکھ کی پتلیاں جم کر رہ گئیں ناسوت کے رشتے ٹوٹنے لگے برزخ کے دریچے کھلنے لگے حلق نے دوا پانی سب سے انکار کر دیا بجز آب زمزم کے اللہ کی کریمی کے قربان کہ اس کے قطرے آخری وقت بھی اتر گئے، چارپائی قبلہ رخ رکھدی گئی ہاتھ پیر برابر کر دیئے گئے اس نامہ سیاہ نے سورہ یاسین آخری بار پڑھنی شروع کی جب آیۂ کریمہ سلام قولاً من رب الرحیم آئی

جی نہ مانا بار بار اس کی تکرار کان کے خوب قریب جا کو کی، ادھر زبان پر فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیئ و الیہ ترجعون آیا ادھر روح پرواز کر گئی ۔ گویا اسے انتظار اسی بشارت کا تھا۔!

موت کے کچھ دیر بعد ہاتھ میں نے چھو کر دیکھے انگلیاں اب تک نرم تھیں یہ وہی ہاتھ ہیں جو داد و دہش میں کیسے کھلے ہوئے تھے اور عبادت کے وقت کیسے بندھے رہتے تھے۔! زمزم میں ڈوبا ہوا کفن اسی گھڑی کے انتظار میں ۲۹ برس سے ساتھ ساتھ پھر رہا تھا آج کام آیا، غسل بیٹی بہو اور پوتیوں نے مل کر دیا۔ پردے کے باہر سے ہم لوگ ہدایت دیتے رہے اور لوٹوں میں پانی بھر بھر کر دیتے رہے غسل و کفن کے بعد نعش ایک آرام دہ موٹر لاری پر وطن لائے، دفن کے لئے جگہ خاندانی مسجد سے بالکل متصل ملی ــ اللہ کی بندی تیری عمر بھر کی آرزو پوری ہوئی۔ اذان کی آواز کے ساتھ تجھے عشق تھا اب جی بھر کر یہ آواز قیامت تک سُنے جا ــــ!

نماز جنازہ اسی نامہ سیاہ نے پڑھائی جنازہ میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے سب کو معلوم ان اذکار و ادعیہ کے ساتھ ساتھ زیر لب تقریباً یہ مناجات بھی جاری رہی ۔ اے مالک مولیٰ آج تیرے حضور میں وہ بندی آرہی ہے جس نے ۵۰ سال کی عمر تک روزہ حتی الامکان ایک بھی قضا نہیں ہونے دیا، نماز ایک وقت کی بھی ناغہ نہ ہونے دی، تیری مخلوق سے محبت کرتی رہی، خود بعد کو کھایا دوسروں کو پہلے کھلایا جو پایا اس میں دوسروں کو شریک کیا، مئی جون کی لپٹ اور تپش میں روزے رکھے، دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی راتوں میں اٹھ کر نماز پڑھی عزیزوں کی قربیوں کی بستی والوں کی غمخوار رہی تیرے نام کی عاشق تیرے رسولؐ کے نام کی دیوانی تھی، میں گواہی دیتا ہوں کہ اس نے میرے ساتھ دنیا میں جو آخری کلام کیا وہ تیرے ہی کلام کے پڑھنے کا حکم تھا آج بوائیں اس کے نام پر ماتم کر رہی ہیں اور یتیم

اس کے لئے سر پیٹ رہے ہیں اس کی موت اس مہینے میں آئی جو تیرے رسول برحق کی وفات کا مہینہ ہے اس وقت آئی جب شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی اس مرض (بخار) میں ہوئی جس میں تیرے رسولؐ نے موت کی شہادت جانی ہے پھر پردیس میں ہوئی جو تیری رحمت کو جوش میں لانے کا ایک ذریعہ ہے ابدی نیند کی جگہ اس نے ڈھونڈھ کر تیرے گھر کے جوار میں پائی تاکہ تیرا نام اس کے کانوں میں پڑتا رہے تیری رحمت تو کسی سہارے کی کسی بہانے کی محتاج نہیں اور پھر اس کے لئے تو اتنے بہانے موجود ہیں۔ اے کریم و شفیق آقا اس کی لغزشوں سے درگزر کیجیو اس کی خطاؤں پر خط عفو پھیر دیجیو اس کے حسنات کو بڑھائیو اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیجیو جو شایان شان ہے تیری رحمت کے تیری صفت ستاری کے تیری صفت غفاری کے۔

~~~~~~
~~~~~~

نازبردار بھائی

حقیقی بھائی میرے ایک ہی تھے سن میں مجھ سے آٹھ سال بڑے، نام عبدالمجید،
ل ولادت غالباً آخر ۱۸۸۲ء۔
نحیف النفس کا روگ بچپن ہی سے لگ گیا تھا تعلیمی ترقی پوری تیزی سے نہ کر سکے
ت تھے شریف مسلمان گھرانوں کے دستور کے مطابق پہلے قرآن مجید ختم کیا پھر اردو فارسی اچھی خاصی
ھی اور عربی کی بھی شد بد تحصیل کر لی۔ یعنی نحو کافیہ تک اور منطق کے ابتدائی رسالے صغریٰ،
ی وغیرہ۔ انگریزی تعلیم لکھنؤ کے کیننگ کالج اور کرسچین کالج میں انٹرمیڈیٹ تک حاصل
ی۔ اور خیال رہے کہ انٹرمیڈیٹ کا مرتبہ آج سے ۵۰ سال قبل وہی تھا جو اب ایم اے
ہے۔ سرکاری ملازمت شروع نائب تحصیلداری سے کی اور جلد ہی تحصیلدار ہو گئے.. اور
حصیلداری بھی خاص شہر لکھنؤ کی ملی۔ ۱۹۲۴ء میں جب ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور اس عہدہ
لکھنؤ، گونڈہ، بستی، سہارن پور، سیتاپور، بہرائچ، فیض آباد وغیرہ مختلف شہروں میں رہ کر
ش لکھنؤ ہی کی ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹی سے ۱۹۴۲ء میں لی اور اس کے بعد بھی دو ایک
ل راشننگ افیسر وغیرہ رہے۔

نیک مزاجی، صلح جوئی، بے طمعی، فقیر دوستی والد مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی۔ ابتداء
ملازمت سے آخر عمر تک قائم رہی۔ سرکاری عہدوں پر رہ کر اچھے اچھوں کی سیرت دگرگو

۵؍ جنوری ۱۹۶۰ء

کی قلعی کھل جاتی ہے یہ ہر جگہ نیک نام اور ہر دلعزیز ہی رہے حکومت سے کام لینے کے بجائے ہر ایک سے بچ کرتے اور گھل مل کر رہے۔ اور دوستی ہی دوستی میں سارے کام انجام دیتے رہے۔ لکھنؤ کی تحصیلداری یوں بھی بڑے معرکے کی چیز ہے۔ کلکٹر صاحب کمشنر صاحب یہاں تک کہ لاٹ صاحب کے ہاں آئے بھی عجیب وغریب فرمائشوں کا نزول روز ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر تحریک خلافت و ترک موالات کا زمانہ تو غضب کا زمانہ تھا۔ اتنی کڑی منزل بھی یہ اپنی مروت اور دوستانے کے قدموں سے طے کر گئے ———— سیاسی لیڈروں میں تعلقات محمد علی، حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی وغیرہ سے اچھے خاصے اور ایک حد تک مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی رہے اور مقامی ہندو لیڈر جل پنڈت ہرکرن ناتھ معراد وغیرہ سے رہے۔ خود کتب بینی اور اخبار بینی کے عاشق تھے اس لئے گہرے تعلقات یا نیازمندی کے اکثر علماء وقت مثلاً مولانا شبلی، مولانا تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا گیلانی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد زکریا سہارنپوری ادیبوں، شاعروں میں اکبرالہ آبادی، ریاض خیرآبادی، اثر لکھنوی، سید جالب، کشن پرشاد کول، آنند نرائن ملا، مہدی افادی، وغیرہم سے رکھے۔ اور بعض سے تو خاصی بے تکلفی قائم تھی۔ مولانا شبلی اور ندوہ والوں سے خصوصی ربط تھا۔ اور قیام سہارنپور کے زمانہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتے تھے۔ فرنگی محل سے تعلقات تو خاندانی اور مثل عزیزوں کے تھے۔

پنشن کے بعد اپنے کو گویا خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور کنبہ اور برادری والوں کے حق میں تو ایک آیۂ رحمت تھے۔ علاوہ اپنی حسب حیثیت مادی امداد کے ہر ایک کے لئے دوڑ دھوپ سعی و سفارش میں آگے آگے اور اس میں نہ اپنی صحت کو دیکھیں نہ گرمی، سردی، موسم کی کسی سختی کی پروا کریں۔ انجمن ترقی اردو، انجمن اصلاح المسلمین مدرسہ قدیمیہ فرنگی محل، دارالعلوم ندوہ، تعلیم گاہ نسواں، مسلم گرلز کالج خدا معلوم کتنے

تعلیمی و رفاہی اداروں کے ایک کارگزار و فعّال ممبر بلکہ اکثر کے عہدہ دار بھی و رکن ایک ہندو یتیم خانہ کمیٹی کے بھی تھے، کام ہر ایک کا کسی کی مروت یا دباؤ میں نہیں اپنے ذاتی ذوق و شوق سے انجام دیتے تھے۔

اپنے معمولات و نظام اوقات کے بڑے پابند تھے منھ اندھیرے اٹھتے اور فجر اول وقت پڑھ کر ٹہلنے نکل جاتے اور کئی میل کا لمبا گشت لگا کر واپس آتے۔ دو چار سال تک مگدر ہلانے کے بھی عادی رہے۔ بعد نماز ظہر ایک پارہ کی تلاوت کرتے اور اب کئی سال سے ہاتھ میں تسبیح لئے اوراد میں بھی مشغول رہتے لاغر و ضعیف الجثہ اور دمہ کے مریض ہونے کے باوجود ان پابندیوں پر اتنی مستعدی حیرت انگیز تھی ـــــــــــ

اُردو اشعار تو بہ کثرت یاد تھے اور کچھ فارسی کے بھی شبلی، اکبر، اقبال، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر کے کلام کے اچھے خاصہ حصے کے حافظ تھے۔

خیر دنیا کے لئے جیسے بھی ہوں اپنے اس تُند خو بھائی کے حق میں تو سراپا شفقت و کرم اور پیکر لطف و احسان ہی تھے اپنی اور بیوی بچوں کی ہر خوشی میری خوشی کے آگے گرد کر رکھی تھی۔ جب تک پنشن نہ ہوئی اور میں نے قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیا ہر ماہ ایک معقول رقم سے میری مالی امداد کرتے رہتے اور اب تک میں دریاباد سے لکھنؤ جب بھی جاتا تو ان کے یہاں ایک چھوٹی سی عید ہو جاتی پر تکلف کھانے اور ہر طرح کی خاطریں اور واپسی میں ناشتہ کے نام سے کچھ نہ کچھ تحفے ساتھ کر دیتے ضرور رہتے تھے۔ خط میں کسی ہفتہ ناغہ نہیں ہوتا بلکہ بار ہا تو خط ہفتہ کے اندر ہی پہونچ جاتا اور آم خربوزہ انگور آڑو خوبانی وغیرہ ہر ہفتہ لکھنؤ سے کوئی موسمی پھل پہنچتے رہنے لازمی۔ سن میں اتنا بڑا ہونے کے باوجود برتاؤ میں کہیں سے بھی بڑائی کا پتہ نہ چلنے دیتے بلکہ صاحب سلامت تک میں اکثر خود ہی سبقت کر جاتے۔ خاندان بلکہ برادری بھر میں ہم لوگوں کی محبت ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی تھی ـــــــــــ محبت مجھے بھی تھی لیکن وہی جیسی ایک بھائی کو دوسرے سے

ہوتی ہے ان کی محبت اس سے کہیں بڑھ کر پدرانہ بلکہ ادرانہ شان رکھے ہوئے تھی میری ناخوشی انھیں کسی حال میں گوارا ہی نہ تھی۔ بھائی بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسا ناز بردار بھائی کم ہی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔

اتنی طویل مدت میں ایسا نہ تھا کوئی سیاسی مذہبی یا خانگی اختلافی مسئلہ ہی نہ آیا ہو۔ کیوں نہیں اس دنیا میں ان طویل سابقوں کے بعد یہ ممکن کیوں کر تھا۔ بار ہا اس کی نوبت آئی لیکن محبت کے غلبہ نے کبھی اسے دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔ بھائی ہونے کے علاوہ ان کے چاروں لڑکوں کی شادیاں میری ہی چاروں لڑکیوں سے ہوئیں۔ ہر صاحب تجربہ جانتا ہے کہ اس چوہرے سمدھیانے نے تعلقات کو کتنا نازک بنا دیا ہو گا لیکن یہ محض ان کی عاشقانہ محبت کا کرشمہ تھا کہ شیشہ میں بال پڑنے کی بھی نوبت کبھی نہ آئی۔

اپنی لڑکی کی شادی تو تمام تر میری ہی رائے اور مرضی کے ماتحت کی ہر لڑکے کی تعلیم و تربیت میں میرے مشورے کو مقدم رکھا۔ اور بڑے اور ہونہار لڑکے[۱] کو بجائے کسی امتحان وغیرہ میں بٹھانے کے مجھ دقیانوسی کے مانگنے پر میرے سپرد کر دیا۔ حفظ قرآن اور اس کے بعد طب اور مشرقی امتحانات دینے کون دوسرا ڈپٹی کلکٹر اسے گوارا کرے --- اپنے ہم سروں کے سامنے اپنی کو نکو بنائے گا۔

۱۷ دسمبر (دوشنبہ) کو انھیں اچھا خاصہ چھوڑ کر دوپہر کی گاڑی سے میں دریاباد واپس آیا۔ حسب معمول خدا حافظ کہہ کر مجھے رخصت کیا (کون جانتا تھا کہ اس عالم ناسوت میں ان کی زبان سے یہ بالکل آخری لفظ میرے کان میں پڑ رہے ہیں) شب تک اپنے معمولات روزمرہ کے مطابق پورے ہوا کیے۔ ایک پاکستانی عزیز رخصت ہونے آئے۔ آٹھ بجے تک ان سے گفتگو رہی۔ نو بجے حسب معمول سونے لیٹے ½ ۲ بجے شب کو متصل لیٹے ہوئے منجھلے لڑکے[۲] کو اٹھا کر کہا اس وقت سانس کی تکلیف زیادہ ہے۔ اس کے بعد کہا "یا اللہ رحم"۔ لفظ اللہ کو تکلیف کی حالت میں خوب کھینچ کر ادا کرتے تھے) انھوں نے دوا پلائی اس کے بعد نیم بیہوشی کی حالت

[۱] حکیم عبد اللہ القوی

[۲] حبیب احمد

تھا تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ یہ سمجھے کہ شاید سو گئے جب کچھ منٹ تک کراہنے اور سانس لینے کی آواز نہ آئی تو انھیں فکر ہوئی اور انہوں نے جا کر اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالقوی کو جگایا! انھوں نے آکر دیکھا تو نبض ڈوب چکی تھی۔ ہل چل مچ گئی۔ دوسرے لوگوں نے بھی آکر دیکھا۔ ایک دوسرے طبیب کو بھی بلا کر دکھایا گیا۔ وہاں اب کیا تھا۔ بندہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچ چکا تھا عبدالمجید اپنے رب مجید کے حضور میں حاضر ہو چکا تھا آخری چیز مرحوم کے جسم میں جو پہونچی وہ آب زمزم کے چند قطرے خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا کے ساتھ تھے۔ اس کی رحمت بے حساب سے کیا بعید ہے کہ نزع کی تکلیفیں نہ ظاہر ہونے اور سکرات کے جھٹکے نہ لگنے سے والناشطات نشطاً کا وعدہ ان کے حق میں پورا ہو چکا ہو!

اطلاع ہونے پر دوپہر کو جب میں پہونچا تو اسی ڈرائنگ روم میں جہاں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نازبردار بھائی کا چہرہ باوجود بیمار بیزار ہونے کے ہمیشہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتا تھا۔ آہ وہ منگرمی پہ نہا یا دھویا ہوا کفن پوش —— خاموش لیٹا ہوا ہے۔ آج میری طرف سے یہ بے التفاتی یہ بے اعتنائی چہرہ اب بھی پر رونق۔ بلکہ ایک حد تک نورانیت لئے ہوئے آنکھ کھلی تھی —————— تو کلمہ شہادت کی آواز جلد سے جلد کان میں ڈالی گئی تھی آج آنکھ بند ہوئی تو کمرے کے در و دیوار اسی اللہ کے نام اور اسی رسول کے برحق ہونے کی شہادتوں سے گونج رہے تھے!

صحن میں مجمع دیکھا تو توقع سے بڑھ کر۔ اطلاع پوری طرح نہ ہو سکنے کے باوجود کیسے کیسے اہل علم و عمل موجود تھے۔ ایک طرف فرنگی محل کے جمال میاں سلمہ، مولانا محمد عتیق و ناصر میاں بکر العلوی وغیرہم دوسری طرف حضرات ندوہ مولانا محمد منظور نعمانی (شیخ الحدیث) مولانا محمد ادریس نگرامی (شیخ التفسیر) و مولانا ابو العرفان وغیرہم۔ تیسری طرف مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر محمد یوسف حسین خاں (پرو وائس چانسلر علی گڑھ) اور حاجی صدیق حسن صاحب (ممبر بورڈ آف ریونیو) وغیرہ۔ حکم اسی کم بضاعت کو نماز پڑھانے کا ملا اور پڑھیاں

سگار علاوہ دعائے مسنون کے تحت الشعور اور زیر لب کچھ اس طرح عرض و معروض کرتا رہا
کہ اے مالک و مولیٰ تیرے سچے پیام لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ تو اس پر رحم کرتا ہے جو
تیرے بندوں پر رحم کرتا ہے تو اپنے اس نرم مزاج و رحم دل بندے کے ساتھ بھی معاملہ
رحم و کرم کا کر اور اس کی ساری لغزشوں اور کوتاہیوں کو اپنی مغفرت کے پردے میں چھپا
دے ـــــــ!

ڈیڑھ بجے کے بعد جنازہ اٹھا اور راہ میں صدہا مومنین نے کاندھا بدلتے ہوئے عیش باغ
کے مشہور قبرستان .... میں پہونچا دیا گیا۔ اور وہاں کچھ مزید مخلصین بھی پہونچ گئے اللہ ان
سب کو جزائے خیر دے اور سیکڑوں غمخوار دل کو جنھوں نے خود آکر یا خط کے ذریعے
تعزیت فرمائی ہے ـــــــ اور اب باقی حضرات سے عرض ہے کہ جو کچھ کہنا
ہو مرحوم کے حق میں اپنے رب ہی کہیں سنیں۔ ہر علمی کام کے لئے بڑی ضرورت خانگی سکون
کی ہوتی ہے۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ میری خانگی زندگی کے سکون میں بڑا دخل
میرے اس مرحوم دلنواز نمردار بھائی کو تھا۔

ہمشیر کی رخصتی

ہمشیر ایک ہی تھیں۔ سِن میں ۴، ۵ سال بڑی عمر میں ۷۰ سال کے اندر۔ عابد اور صالحہ
سی کہ دور دور تک مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ حاجیہ، تہجد گزار، نماز تلاوت کی عاشق
بت و بدگوئی، لڑائی جھگڑے سے نا آشنا، ایک ایک کی ہمدرد و غمخوار۔ ۳۵ سال کی عمر میں بیوہ ہو
یں تھیں اولاد کوئی نہ تھی۔ وسط اپریل میں لکھنؤ میں بیمار پڑیں اور بیماری کے وہ شدائد کہ الامان
وہ تیمارداری کی راتیں، کبھی مایوسی کی تاریکیاں، کبھی امید کی ہلکی سی شعاعیں۔ ابھی قرآن مجید
ہ پڑھ کر سنایا جا رہا ہے، درود کر دعائیں مانگی جا رہی ہیں اور ابھی غفلت پھر امیدوں کے
اب دکھانے لگی! پورے ایک ہفتہ موت و حیات کی کشمکش میں گزرا۔ سورہ یٰسین دن میں کئی
پڑھی جاتی رہی اور دوا سے زیادہ استعمال آبِ زمزم اور شہد کا رہا۔ اپریل ۵۶ء کی
می اور جمادی الاولیٰ کی ۵ ر کہ دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا اور جو صابر و شاکر
دی شائد جنت ہی کے لئے بنی تھی جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ غم نصیب ناکارہ سورہ یٰسین
رہا تھا اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا! گزرنے والی کی پیشانی پر پسینہ
قطرے دیکھے گئے اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمہ شہادت کی
داؤں سے گونج اٹھا! ___ موت شائد ہر مومنہ کی یوں ہی ہوتی ہے! غسل کے بعد
ہ پُر رونق تھی، معصومیت تھی، کوئی اثر نہ ضعف کا نہ مرض کے شدائد کا! ___ ایسا
ونق و شاداب چہرہ شاید زمانہ شباب میں ۲۰، ۲۵ سال قبل رہا ہو گا! نماز جنازہ لکھنؤ
شہور عارف باللہ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری نے پڑھائی، کئی دن قبل سے دعاؤں

صدق لکھنؤ ۲۵ ۱۹۵۶ء

میں بھی لگے ہوئے تھے۔ جماعت میں شریک مولانا محمد اسلم فرنگی محلی مولانا عبدالباری ندوی خلیفہ
مجاز حضرت تھانویؒ، مولانا محمد عمران خاں ندوی اور دوسرے صاحبین تھے۔ مولانا محمد شفیع فرنگی
محلی اور دوسرے حضرات بعد کو پہونچے۔ تدفین بعد مغرب مشہور گورستان عیش باغ کے نئے
چمن میں ہوئی۔ شب دوشنبہ شروع ہو چکی تھی۔ قبر میں یہ نابکار سیاہ اپنی عمر میں پہلی بار اترا اور
جس نے نہ عمر بھر ان کے بہن ہونے کے حقوق ادا کئے تھے اور نہ سن میں بڑے ہونے کے، اس نے عالم ناسوت
کی یہ آخری خدمت اپنے ہاتھ سے انجام دی! — سن میں بڑی تھیں، مگر ساری عمر اپنے کو چھوٹا
بنا کر رکھا تھا۔ آج اپنے پروردگار کے حضور میں انشاء اللہ ہر طرح بڑے عمل سے سرخرو ہو
رہی ہوں گی!

دل کی خالص، بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے تو بہن ہی کی ذات
میں۔ ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے۔ اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی! نعمت کا حق
اتنے دنوں کب ادا ہوا تھا جو اب کبھی آئندہ اس کی امیدیں قائم کی جائیں — ہمیشہ کی
رخصتی ایک شادی کے وقت ہوتی ہے اور ایک یہ۔ وہ مجاز اور یہ حقیقت!

عقلاً صبر، بمعنی تسلیم و رضا داخل ایمان ہے، لیکن طبعی حزن و غم پر بس نہیں۔ زندگی
میں جو مستقل خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ زندگی بھر کے لئے ہے۔ صدق کے پڑھنے والے بھائی اور بہن
اگر کوئی ہمدردی محسوس کریں تو بجائے تعزیت نامہ پر وقت صرف کرنے کے، وہیں اپنی جگہ دعائے
خیر فرمائیں اور اگر ہو سکے تو کچھ قرآن پاک بقدر بھی آسانی سے پڑھ سکیں مرحومہ کو بخشدیں۔

غم اور طبعی غم میں، غم آفرین نے لذت بھی بلا کی رکھ دی! اور قلب کی قساوت کا تو اس غم
سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں، کاش اسی کے اثرات میں پائیداری ہوتی! — عجب شانِ حکمت
ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے ہیں تو ہنسا کر، اور عارضی طور پر واپس لیتے ہیں تو رلا کر،
جسم کی لذت اُس میں، روح کی حلاوت اِس میں!

بوڑھی محبوبہ

۱۸ شوال یوم شنبہ تھا اور جنوری ۱۹۶۹ء کی پہلی تاریخ کہ ۱۲½ بجے شب کے بعد ایک مومن بندی کی روح ۷۰، ۷۲ سال کی عمر میں اپنے مالک و مولی کے حضور طلب کر لی گئی جیسی کہ بے شمار روحیں ہر لمحہ و ہر آن طلب ہوتی رہتی ہیں۔ نغفر اللہ لنا و لہا یرحمنا و یرحمہا یا ارحم الراحمین۔ اللہ اس کے موجودہ مسکن کو جنت کے پھولوں سے بھر دے اور اسے جنت ہی کا ایک چمن بنا دے۔

جون ۱۹۱۶ء میں اس تباہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھی۔ ۵۲ سال کی مدت رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی جبکہ رفاقت محض رسم و ضابطہ کی نہ ہو بلکہ اس کی بنیادیں الفت و محبت پر قائم ہوئی ہوں! ـــ پیمانِ وفا عمر بھر کا تھا لیکن خود عمر کی پائداری کتنی ہے؟

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شادی جس وقت ہوئی طرفین ۵۰، ۷۰ برس کے بوڑھے کھوسٹ نہ تھے۔ ایک طرف ایک شوخ قبول صورت نوجوان لڑکی تھی ۲۰-۲۱ سال کی عمر کی اور وقت کے معیار سے خاصی پڑھی لکھی، انگریزی کی شدبد سے واقف۔ اور لکھنؤ کے اونچے معاشرے کی تربیت یافتہ اور دوسری

منقول از صدق جدید ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء

طرف ۲۴ سالہ نوجوان انگریزیت میں غرق دین و مذہب کے نام سے بیزار عقلیت کا پرستار لڑکی کہیں باہر کی نہیں اپنے خاندان ہی کی تھی حقیقی خالہ کی پوتی رسم و رواج خاندان کے برخلاف اسے شوق اور چاؤ کے ساتھ خواستگاری کرکے لائیں والا بشی اور نیم اسلامی حیا داری کے حدود کے اندر رہ کر راہ و رسم دیار محبوبی کے قدم ایک ایک کرکے اٹھتے رہے تا آنکہ شوہر کو دو چار سال بعد از سر نو سعادت اسلام نصیب ہوئی دونوں نے ۱۹۲۹ء میں مل کر حج کیا اور آخر سن کے تقاضے سے وہ وقت بھی آگیا جب زلفوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو گئی دانتوں کی جمی ہوئی لڑی ساری ایک ایک کرکے بکھر گئی۔ چہرے پر جھریوں لکیرھیاں پڑ گئیں۔ قد و قامت میں کوئی شائبہ رعنائی کا باقی نہ رہا حسن و جمال کی جگہ صرف نور عصمت کی جگمگاہٹ باقی رہ گئی!

ہے حقیقت مجاز اب یہ کھلا ہے حجاب کے راز
سب ہے فریب آب و گل حسن و جمال کچھ نہیں

مسلسل اور متعدد بیماریوں نے معذور اور تقریباً فریش بنا ڈالا۔

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

اس پر بھی اس رشتہ محبوبیت میں بحمد اللہ ذرا بھی فرق نہ آیا! —— اور بدبخت شاعر اور افسانہ نویس حقیقت حال سے منزلوں دور اور بیگانہ ہیں جنھوں نے الفت و محبت کے کرشموں کو صرف جوانی کے چند برسوں تک محدود رکھا ہے۔

ادل ہاتھ میں لینے والی چیز حسن صورت نہیں حسن سیرت ہوتی ہے اور اللہ کے اس دولت سے حصہ وافر دیا تھا۔ عورت کا جوہر سسرال والوں کی خدمت کرنا ہے اس مرحومہ نے یہاں آتے ہی میری والدہ اور ہمشیرہ کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیا جو خاندان مشترکہ

پھیلا تا ہے اس میں آپس کے سابقہ کی الجھنیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں میرے بھائی اور
بھاوج دونوں اس سے رام ہو گئے۔ خاندان کے دوسرے عزیز و اقارب ملنے والوں
گھر کی خادماؤں سب پر اس نیک بخت کی میٹھی زبان خوش مزاجی، فیاض طبعی نے اپنا سکہ جما لیا
تھا۔ داد و دہش و غریب پروری داخل فطرت تھی۔ ابتدائی ماحول اہل رسوم و بدعات کے
درمیان رہا۔۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ حضرت تھانوی سے قرب و اعتقاد بڑھتا ہی گیا اور
میرے تمام مخلص بزرگوں مولانا گیلانی اور سید سلیمان ندوی اور علی الندوی وغیرہم کے خیالات سے
استفادے کے پورے موقع ملتے رہے۔ نماز کی تارک شروع میں بھی نہ تھیں کچھ روز میں پوری
پابند ہو گئیں۔ روزے جب تک قوت باقی رہی پابندی سے رکھتی رہیں۔ آخر عمر میں فدیہ
ضابطہ دیتی رہی تھیں۔۔۔۔ مسلمانان عالم کی فلاح و بہبود کے لئے دل میں تڑپ تھی۔
ردولی ہی کے ایک خاندان نے اپنا وطن شہر بارہ بنکی پچیس قبل بنا لیا تھا وہی میکہ تھا۔
اس کی محبت دل میں رچی بسی ہوئی تھی۔

ماں بڑی عابدہ بائی تھیں وہ وہیں دفن تھیں بڑی تمنا ان ہی کے پہلو میں دفن ہونے
کی تھی۔ بھائی (خان بہادر مسعود الزماں بیرسٹر اور نائب صدر یوپی کونسل مرحوم) کی دو پوتیوں کی
شادی بارہ بنکی میں ۲۹ دسمبر کو طے پائی، شروع رمضان میں وہیں چلی گئیں۔ عید سالہا
سال کے بعد وہیں کی۔ شادی کے بعد دو ایک ہفتہ وہیں قیام کا ارادہ تھا کہ پہلی اور دوسری
جنوری کی درمیانی شب میں بلاوا وطن حقیقی سے آگیا! اور مسبب الاسباب نے گورستان
میں ہی دفن ہونے کا سامان یوں بہم پہونچا دیا۔ دعائیں قبول ہوتی ہے ایک بڑی آرزو
شب جمعہ پانے کی تھی تو وفات کے لئے تو نہیں لیکن تدفین کے لئے شب جمعہ ہی نصیب
ہوئی۔

۵۲ سال کی طویل رفاقت میں جدائی کا اتفاق کبھی بھی تین چار ہفتوں سے زیادہ
نہ ہوا۔ ہمیشہ کہنا چاہیے کہ یکجائی ہی رہی۔ اب کی بار (اور آخری) روانگی جب بارہ بنکی کے لئے

۲۱ رمضان (۸ دسمبر) کو اختیار کرنے لگیں تو اپنے ساتھ وہ کفن بڑے اہتمام سے سامان میں رکھ
لیا جو سالہا سال سے آب زمزم میں تر کیا ہوا محفوظ تھا۔ ایک مخلص نے مکہ معظمہ سے مجھے
خانہ کعبہ کی چھت کے کچھ ٹکڑے بطور تبرک بھیج دیئے تھے ان میں سے بھی ایک ٹکڑا اپنے ہمراہ رکھ
لیا۔ پہلی اور دوسری جنوری کی درمیانی شب میں ۱۱ بجے تک جاگتی بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔
میری بڑی لڑکی ہمراہ تھی اور انگیٹھی کے گرد بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری زبان سے کبھی سنا ہوا
قصہ بیان کیا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم تیسری صدی ہجری کے شروع کے بزرگوں میں ہوئے
ہیں صحیح بخاری کی راویوں میں ہے۔ ان کی وفات پران کے ایک معاصر نے انھیں خواب
میں دیکھا اور حسب توقع اچھی حالت میں دیکھا پوچھا کیا ماجرا گذرا انھوں نے فرمایا کہ
قبل اس کے کہ کوئی سخت سوال یا جرح مجھ سے شروع ہو، میں بہ اطمینان تمام مسکرایا۔
سوال ہوا کہ عین سوال و جواب کے موقع پر یہ تبسم کیسا؟ میں نے عرض کیا مجھ سے حدیث
بیان کی فلاں فلاں سے اور اس نے فلاں صحابی سے اور اس نے رسول اللہؐ سے۔ اور آپ نے
فرشتہ جبریل سے اور انہوں نے تجھ ..... تبارک و تعالیٰ سے کہ مجھے بوڑھے مومن
سے جرح کرتے مروت مانع آتی ہے۔ اور میں سفید بال لے کر تو بہر حال آیا ہوں۔ بس اس
سے مجھے اطمینان ہے۔ اس پر معاً جواب ارشاد ہوا کہ سچ کہا جبرئیل نے اور سچ کہا
ہمارے رسول نے اور سچ کہا ان صحابی اور فلاں فلاں راویوں نے بے شک اسی پر تمہاری
مغفرت ہوئی جاتی ہے۔

یہ روایت میں نے کبھی حضرت تھانوی کی زبان سے سنی تھی (دو ایک جزئیات میں
جو کچھ بھی فرق ہو گیا ہو ......) حکایت سن کر اور بھی سننے والیاں متاثر ہوئیں اور
اللہ ری بندہ نوازی۔

لاشعوری طور پر بشارت کا یہ منظر پیش آ جانے کے کوئی گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹہ
کوئی ساڑھے بارہ بجے مرحومہ کو سوء تنفس اسانس پھولنے کی شکایت پیدا ہوئی اور رہ گئی

سٹ میں اکثر پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ لڑکی کو جگا کر وہ دوا استعمال کی جو ایسے موقع پر نفع کر جایا کرتی تھی۔ آج نفع نہ ہوا۔

بہنیں اور بھتیجیاں وغیرہ سب بھاگ کر آگئیں۔ ان کے حقیقی بھتیجے لکھنؤ میڈیکل کالج کے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ ڈاکٹر پاس ہی کے کمرے میں تھے اور گولیاں نکال کر انھوں نے چاہا کہ گولی ہاتھ میں لے کے اپنے حلق تک لیجائیں کہ معاً سر جس طرح نیند سے جھوم کر کوئی بیٹھا ہوا شخص گرنے لگتا ہے۔ یہ لیٹنے لگیں لڑکی نے اپنی گود میں لے لیا اور آناً فاناً روح قفس جسم خالی کر گئی۔ انھیں چند لمحوں کے اندر بغیر کسی خاص کشمکش کے۔ بدحواس نورِ نظر ڈاکٹر بھاگتا ہوا گیا اور دوڑتا ہوا انجکشن لایا لگانا چاہا مگر تقدیر کے آگے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زبان بے بس یہ نکل سکا کہ اب دوا کا وقت گزر چکا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ نزع وسکرات کے ان چند مختصر لمحوں میں ایک نہیں دو بار کلمۂ شہادت زبان سے ادا کیا۔ ایک بار خود سے کہا کہ دیکھو اب سانس میں کھٹک پیدا ہو گئی معاً بعد قبض روح پیشانی پر پسینے کے چند قطرے دیکھے گئے آخری دیدار جب کفن چہرہ سے سرکا کر کرایا گیا تو میرے علاوہ اور لوگوں کا بیان ہے کہ چہرہ قبلہ رو تھا چہرہ پر تسکین و لبشاشت تھی آنکھیں بالکل بند تھیں ہونٹ بالکل بستہ چھوٹی ٹھڈیا پوری گولائی لئے ہوئے تھی (حالانکہ دانت گر جانے کے بعد یہ قطع عموماً باقی نہیں رہ جاتی) اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اور ہلکی سی سرخی تھی۔

---

۲ جنوری ۱۹۶۹ء (جمعرات) کو قریب شام ایک لاری ۴۵ - ۵۰ مسافروں سے بھری ہوئی لکھنؤ سے باندے جا رہی ہے اور اس وقت کان پور کے حدود میں داخل ہو رہی ہے سفر تعزیت کی نہیں ماتمی ہے تین لڑکیاں ہیں جو ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے ماں کے سایہ سے محروم ہوئی ہیں اور جس کا جنازہ اپنی بچیوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک ۵، ۶، ۷ سال کا بوڑھا ہے جو ابھی دنیا کی عزیز ترین متاع سے محروم ہو چکا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بڑے

دوسرے عزیز و قریب ہیں۔ کسی کی زبان پر کلمۂ شہادت اور کسی کی زبان پر قرآن کی سورتیں اور اکثر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ وقت سوا پانچ سے گزر چکا ہے۔ آفتاب زرد پڑ چکا ہے اور ہر منٹ بلکہ ہر سکنڈ اور ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہے ——— کھلے میدان میں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے دل ہمیشہ اس سے متاثر متاثر ہوا ہے۔ رفیقہ زندگی ہی کے آخری لمحات حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے آج یہ خیال نہیں واقعہ ہے۔ قال نہیں حال ہے۔ اپنی دنیوی زندگی کے لطف و سکون و راحت کا آفتاب .... ڈوب رہا نہیں بلکہ واقعۃً ڈوب چکا ہے

۱۰ بجے شب کو لٹا پٹا قافلہ باندے یوسف منزل کے پھاٹک پر پہونچا۔ اس ۵۲ سال کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار اس ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ ہر بار اس سے کس درجہ مختلف! آج کی آمد سب سے نرالی تھی۔ در و دیوار تک گویا رو رہے تھے۔ کفن پوش جسم کو خاموش و ساکت ہوئے ۲۲ گھنٹے ہو چکے تھے۔ باندے لکھنؤ اور پھر دریاباد رابطہ قائم کرنے ہی میں ٹیلیفون اور تار دونوں کے ذریعہ سے ۱۰ - ۱۲ گھنٹے لگ گئے تھے۔ باقی ۱۰ گھنٹے پہونچنے کی کوشش میں لگ گئے! ــ لاشۂ بے روح کو سامنے دیکھ کر کیا گزر رہی ہے یہ نہ پوچھئے۔ وہ وقت بہرحال یاد آگیا جب کسی بڑے سے بڑی خوش جمال و خوش صفات کا خاتون ذکر سننے میں آتا تھا اور طبیعت میں بجائے کسی قسم کے رشک کے ایک گونہ فخر و اطمینان ہی قائم رہتا تھا۔ بقول استاد شبلی ؎

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرورِ آں کہ من ہم آستاں داشتم!

نعمت بہرصورت فانی ہی تھی ——— اور وہی چار لمحہ کے بعد یہ صدا بلند ہوئی کہ ناسوت کی آخری زیارت ختم۔ بس اب آئندہ دیدار انشاء اللہ جنت ہی میں نصیب ہوگا!

———×———

زندگی میں جب کبھی بھی وفورِ اُنس وافراطِ تعلق پر نفس کو تنبیہ ہوتی تھی۔ تو ذہن کے سامنے دنیا کے، دنیا کے محتاط ترین، مقبول ترین، متوازن ترین، دانا ترین بشرؐ کا اسوۂ حسنہ مائی عائشہؓ اور مائی خدیجہؓ اور پھر کم وبیش اُمت کی دوسری ماؤں کے ساتھ آجاتا تھا اور آفتاب عالمتاب کے نور کے آگے کسی صوفی کسی مجذوب، کسی راہب، کسی یوگی کی حماقت کی ہستی ہی کیا تھی!۔

اور اپنے زمانے کے مرشد کامل دہادی سبل حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی نظیر بھی سامنے تھی جب کبھی حضرت کے سامنے اپنا یہ حال رکھا جواب میں بہ کمال لاطفت یہی تسلی ارشاد ہوئی کہ

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

در چھوٹے اگر بڑوں کے نقش سے تسکین ورہنمائی نہ حاصل کریں تو کیا کریں!

غرض یہ کہ جس وقت کے آنے کا دھڑکا سالہا سال سے ہر گھڑی لگا چلا آرہا تھا وہ آخر اپنے وقت موعود پر آہی گیا۔ اور جس حیّ وقیوم نے صبر کا مطالبہ کیا۔ اسی نے گرتی ہوئی قوت بھی صبر کی بخشدی، کارخانۂ کائنات میں ایک ذرّہ بھی فرق نہ آنے پایا! اور دنیا جس طرح چل رہی تھی۔ بےشک اُسی طرح چلتی رہی۔ کل شیئ ھالک الا وجہہ اور کل من علیہا فان قسم کے ارشادات بےمعنی نہیں، سرتاسر بامعنی ہی تھے۔ ——— اپنے مخدوم بزرگ اور محترم دوست مولانا سید سلیمان ندویؒ فاضل وعارف تھے، شاعر نہ تھے لیکن شعر بھی خوب کہہ لیتے اپنی زوجہ ثانیہ سے بکمال لطف والتفات رکھتے تھے۔ وفات پر مرثیہ کہا اس کے اس شعر میں شاعری نہیں کی حقیقت کی ترجمانی کی ہے ؎

تیرے جانے سے گماں برہمیٔ دہر کا تھا
ڈگمگیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!

کسی بندہ کی خود یہ خام خیالی بھی کس درجہ طفلانہ ہوسکتی تھی! حدیث نبویؐ پر آیا۔

ہے کہ جسے ہم مسلمان اچھا کہیں اس کی مغفوریت کی امید رکھو پھر جسے زبان ہی سے اچھا کہنے والے نہیں بلکہ جس پر آنکھوں سے آنسو بہانے والے ہم سے کئی گنے زیادہ بحمداللہ نکل آئے ہیں اس کے حق میں کسی کی شان غفاری سے کسی اغماض کا احتمال بھی آخر کیسے کیا جائے!
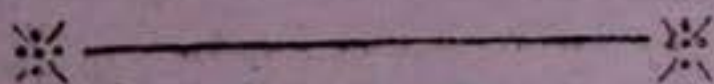
اے الٰہ العالمین! اس عفت شعار کی ناسوتی زندگی ختم ہو گئی، جلد ہی اپنے پروردگار اور ہمدرد و رحمت والے مالک کے حضور میں حاضر ہو گئی ہے، کسی ظالم و جابر حاکم کے دربار میں نہیں ---! تجھ سے بڑھ کر رحم و فضل کرنے والا اور کون ہے، تو ہی سرچشمہ ساری مہر و بخشش کا ہے، تیرے آگے سفارش و شفاعت کی زبان کہاں سے کھول سکتا ہوں صرف ایک چشم دید ہمہ وقت گواہ اور ویسے بھی بطور ایک عاجز و درماندہ بندے کے دو ایک گواہیاں عرض کئے دیتا ہوں۔

۱: جب یہ بیاہ کر آئی ہیں، یہ بہر حال مسلمان اور تھوڑی بہت پابند مذہب تھیں، انھیں [illegible] والی ہر کوشش مجھے مذہب کے دائرہ میں دوبارہ واپس لانے کی کر ڈالی اور بالآخر تصحیح عقائد کے بعد تجدید عقد ہو کر رہی۔

۲: اس وقت کے جاہلی رواج خاندانی کے ماتحت اس کے عقد کا مہر ۳/۴ ۱۱ لاکھ اشرفیاں یعنی لکھو کھا روپیہ قرار پایا تھا، خود انھیں نے آگے چل کر مسائل سے واقفیت کے بعد اس فرضی و افسانوی تعداد کو گھٹاتے گھٹاتے پچاسوں یا چند دہائیوں تک کے سوا سب معاف کر دیا تھا اور مہر کی رقم میرے اس وقت کے حسب حیثیت تھی وہ معاً ادا کر دی گئی یہ کتنا بڑا احسان ان کا میری گردن پر رہا۔

۳: میرے قصد حج کے وقت بھی چلنے پر آمادہ ہو گئیں، بغیر مجھ سے ذرا بھی روپیہ لئے خود ان کے پاس بھی کہاں تھا، اپنا زیور اپنی بہن کے پاس رہن رکھ کر ان سے روپیہ لیا اور تمام تر اپنے خرچ پر میرا ساتھ دیا، یہ ان کا دوسرا احسان ہے جسے میں بھول نہیں سکتا۔

۴: شروع زمانہ میں میں بڑا ہی سخت گیر آقا تھا، اور نوکروں چاکروں پر بڑی ہی سختی

تا بھی بیچاری ہر بار سامنے آکر سینہ سپر ہو جاتیں۔

خدمت قرآن یا خدمت صدق وغیرہ کے سلسلہ میں اگر کوئی بھی خدمت دین کسی درجہ
ں بھی قابل قدر تیری نظر میں مجھ بے مایہ و تباہ کار سے بن پڑی تو وہ ہرگز مجھ سے نہ بن پڑتی اگر
ہ خانگی سکون قلب مجھے حاصل نہ ہوتا جو تیری اس بندی کے طفیل میں مجھے نصیب ہوا۔

لوگ تعزیت کو میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تباہ ہو گئے، آپ کا گھر اجڑ گیا
غیرہ۔ میں حیران ہوں کہ کیسی تباہی اور کہاں کی ویرانی ——— اللہ اپنے عزیز بندے کو
بہترین ساعت میں اس دنیا میں بھیجتا ہے جو اس بندے کے حق میں ہو بہترین ساعت
تی ہے اسی میں اسے واپس بلاتا ہے اس میں ویرانی و بربادی کا ذکر کہاں سے آگیا۔

اس بندی کے اٹھ جانے سے مجھے یقیناً قدرۃً متعدد تکلیفیں اور بے چینیاں ہیں اور میں
ں پر ہرگز خوشی سے آمادہ نہیں لیکن اگر تیری مرضی اسی میں ہے تو میں ایک بار نہیں ہزار بار
س پر راضی ہوں عقلاً و ارادۃً شائبہ بھی کسی ناخوشی و ناگواری کا اپنے دل میں نہیں لاتا۔

~~~~~
~~~~~

شفاء الملک دریابادیؒ

۱۳ اکتوبر ۵ بجے صبح دریاباد غریب خانہ سے دو قدم پر حویلی لکھنؤ بلکہ ملک کے نامو
حکیم حاجی عبدالحسیب دریابادی صدر انجمن طبیہ یو۔پی اور قدیم ممبر انڈین میڈیسن بورڈ کی
ہے۔ آج خلاف معمول ان کے ہاں منھ اندھیرے سے یہ چہل پہل کیسی؟ نوکر چاکر، عزیز
و دوست اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ گیس کی روشنی میں کام ہو رہا ہے کرسیوں کی جھاڑ پو
ہو رہی ہے کمرے میں فرش و فروش بچھ رہے ہیں۔ کوئی تقریب ہے؟ تقریب کیسی
تو یکم محرم ہے کوئی اور تہوار ہے؟ حکیم صاحب تو عید بقرعید بلکہ ہولی دیوالی کو بھی
سے وطن آیا کرتے ہیں اور جب ہی ان کے لئے یہ ساری تیاریاں پچھلے پہر سے شروع ہو
ہیں ـــــ جی نہیں ان کا جنازہ آرہا ہے۔ میت لاری پر شفاء الملک دریابادی کی آ
ہے ـــــ!

کہنے والا یہ کیا کہہ گیا؟ اور ذرا سے فقرے سے کتنے دلوں پر بجلی گرا گیا! اب تو
کو ہے، بازاروں میں چوراہوں اور گلیوں میں لوگ ٹولیاں بنائے ہر جگہ یہی تذکرہ کر ر
ہیں، ہر زبان پر یہی حسرت ناک نوحہ ہے اسٹیشن کا تار والا جو ایکسپریس تار لئے ہوئے تا
کی چھاؤں میں غریب خانہ تک گیا، پکار پکار کر یہ کہتا بھی گیا تھا، ماتم کرنے والوں میں بو
بھی ہیں اور جوان بھی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی! اور مسلمان تو خیر ہوتے ہی ہندو بھی

صدق جدید
یکم دسمبر ۱۹۵۰ء

بلکہ میں بلکہ اچھی بڑی تعداد میں ہیں۔

خبر پر یقین آئے نہ آئے، کوئی مان رہا ہے کوئی جھٹلا رہا ہے اور آسانی سے یقین آئے بھی تو کیسے؟ ابھی چند گھنٹے قبل یعنی جمعرات کی شام تک تو حکیم صاحب اچھے خاصے نسخہ لکھتے ہے، دوسروں کی صحت و زندگی کے ضامن بنے ہوئے تھے، گردہ وغیرہ کی جو شکائتیں تھیں وہ بھی اس وقت دور ہو چکی تھیں اور آٹھ بجے شب کو ایک ڈاکٹر دیکھ کر یہ کہہ گئے تھے کہ حکیم صاحب اب اچھے ہیں صرف ضعف باقی رہ گیا ہے —— بشر کی رائے اور اندازہ موت و زندگی سے متعلق! تکلیف دس بجے رات کو شروع ہوئی، کل چند منٹ کے اندر شاید پانچ منٹ کے اندر کش مکش کا خاتمہ!

درد قلب کا دورہ اور شدید ضعف، ہر امکانی تدبیر کے لئے حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم محمد امین سلمہ پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ موجود سفر آخرت کی عجلت رکھنے والے طبیب کو نہ مگر نہ فرصت اس وقت مال و اولاد پر توجہ والتفات کی زبان پر توبہ استغفار ہاتھ دعا کے لئے آسمان کی طرف اٹھے ہوئے۔ حاضرین سے بہ اصرار فرمائش کہ میرے کلمہ شہادت کے گواہ رہنا۔ آخری مشروب آب زمزم کے چند قطرے اور آخری کلام کلمہ شہادت اور یہ آیۃ کریمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ —— جسم صاحبزادے کے آغوش میں اور روح عالم بالا کی سیر کو روانہ ہو گئی۔

رات یاد کر لیجئے کہ جمعہ کی تھی اور ماہ محرم کا مبارک عشرہ اوّل ابھی شروع ہو چکا تھا یوں کہئے کہ ارادی اور تکوینی دونوں قسم کی خوش نصیبیاں اکٹھی ہو گئیں ساری رات والوں اور نواسیوں اور بہو اور لڑکی اور عزیزوں رفیقوں مخلصوں نے تلاوت کرتے نمازیں پڑھتے دعائیں مانگنے میں گزار دی، تعزیت میں آنے والوں اور ٹیلی فون پر تعزیت کرنے والوں کا تانتا رات کے ڈیڑھ بجے تک لگا رہا، رونے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی عیسائی بھی اور سکھ بھی اور آنے والوں میں منسٹروں ہائی کورٹ

خود ججوں، علماء اور اطباء و معاصرین سے لے کر ہما شما سب ہی تھے۔ بامومت اس کی بھی ججے طبیبوں کی مجلس نے اتفاق رائے کے ساتھ "محسن طب" کا لقب دیا تھا۔

غسل صبح تڑکے عزیزوں اور صالحین کی ایک جماعت نے دیا۔ کفن کے لئے آب زمزم سے دھلا ہوا کپڑا جو کئی سال سے ساتھ رہتا تھا وہ آج کام آیا۔ نو بجے نماز جنازہ کا وقت آیا۔ کوٹھی (واقع کنٹونمنٹ روڈ) کا صحن نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گیا اور نماز مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی کی امامت میں ادا ہوئی۔ چہرہ کی رونق، جنازہ کی وہ پھبن کہ گویا دولھا بارات لیکر روانہ ہو رہا ہے۔!

۱۲ر اکتوبر دوپہر دریاباد۔

آج قصبہ بھر میں ہڑتال ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب نے اپنی اپنی دوکانیں بلا کسی کے دباؤ و ترغیب کے خود ہی غم و الم میں بند کر رکھی ہیں۔ اور گھر پر تو کہنا چاہیے ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔ چار چار پانچ پانچ کوس کے لوگ اپنے "محسن طب" کی آخری زیارت کو جوق در جوق جمع ہو گئے ہیں اور لکھنؤ کے بارہ بنکی، فیض آباد سے جو بخصوص مخلصین موٹر یا ریل سے آگئے ہیں وہ ان کے علاوہ ــــــ وفات شب جمعہ میں، تدفین بعد نماز جمعہ عین صحن مسجد کے پائیں میں، یہ چیزیں کس کے نصیب میں آتی ہیں بجز ازلی خوش نصیبوں کے ــــ لاری رکتی رکاتی بارہ بنکی اور دریاباد کے ریلوے اسٹیشن پر مشتاقان دید کی تمنائے دید کو پورا کرتی ہوئی بعد دوپہر پہونچی ہے۔ حکیم صاحب کو وطن سے محبت بھی کس قدر تھی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ باوجود ۴۰ سال سے لکھنؤ ہی کے ہو جانے اور عمائد لکھنؤ میں شمار ہونے کے وصیت اپنے وطن کی ہی تدفین کی بہ تاکید کر گئے۔ بلکہ خاندانی مسجد کے پائیں صحن میں جگہ تجویز کر گئے تھے۔ یہاں پہونچ کر نماز دوبارہ ہوئی۔ اس لئے کہ بعض قریبی اعزا لکھنؤ میں نماز سے محروم رہ گئے تھے۔ اب کی نماز قرابت قریبہ کی بنا پر ان نا ہمشیرہ زادہ سے پڑھوائی گئی۔ اور اس طرح اسے بھی ایک موقع اس طبیب نامور کی آخری

خدمت کا مل گیا۔ ہجوم کا یہ عالم کہ اتنی بڑی جماعت جنازہ قصبہ کی تاریخ میں تو کسی کے علم میں نہیں ـــــ دفن سے قبل جب اس چہرہ کی آخری زیارت کے لئے جو از خود قبلہ رو تھا اذن عام ہوا تو کچھ نہ پوچھئے کہ خلقت کس طرح ٹوٹی پڑ رہی تھی معلوم ایسا ہو رہا تھا کہ شام ہو جائے گی اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آئے گا۔ میں اس وقت قصبہ کے بعض خوشحال ہندوؤں کو محض آنسو بہاتے نہیں بلکہ زار و قطار روتے ہوئے ان آنکھوں نے خود دیکھا اور قصبہ کی جو بیوائیں اپنے سرپرست کو رو پیٹ رہی تھیں ان کے اعداد و شمار اب کون فراہم کرتا ـــــ!

کم و بیش مذہبی ہمیشہ سے تھے۔ اب ادھر ۱۲۔ ۱۵ سال سے دینداری میں خاصی ترقی کر لی تھی۔ نماز روزہ کے فرائض کے علاوہ تلاوت کے بھی بڑے شائق اور پابند ہو گئے تھے۔ اور تہجد بھی جب آنکھ کھل جاتی اور موقع مل جاتا تو پڑھ لیا کرتے تھے۔ بعد نماز فجر دیر تک اپنے معمولات پورے کرتے رہتے۔ ۴۔ ۵ سال ہوئے حج و زیارت سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ اور لوگوں کو کھلانے پلانے، دینے دلانے میں تو برابر قدم آگے ہی رکھتے تھے۔ عزیزوں اور بستی والوں کا خیال خاص طور پر رکھتے تھے۔ اس کے باوجود تمکنت نہ تھی۔ زندہ دلی اور بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ تعلقات بڑے بڑے حکام، امراء، رؤسا سے گہرے تھے۔ تمکنت نام کو بھی نہ تھی۔ غریب سے غریب شخص سے بھی اسی شفقت اور ملائمت سے پیش آتے اور کوشش یہ کرتے کہ اس کا دل ہاتھ میں لئے رہتے ـــــ ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکی کی شادی لکھنؤ میں کی۔ دعوت بڑے پیمانہ پر نیاز ہ بادس میں کی تھی ایک صاحب شریف صورت مگر بہت پھٹے حالوں بن بلائے آ کر شریک ہو گئے اسی دسترخوان پر جو "میاں لوگ" بیٹھے ہوئے تھے انھیں سخت ناگواری پیدا ہو گئی اور انھوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ جو صاحب منتظم دعوت تھے انھوں نے یہ رنگ دیکھ کر سختی سے ان صاحب سے اٹھ جانے کو کہا۔ یہ زیادتی دوسرے

مریض کی حتی اور کم از کم مجھ سے تو نہ دیکھی گئی دوڑ کر حکیم صاحب کو بلالایا وہ آتے ہی ان بن بلائے مہمان کی طرف مخاطب ہو کر بولے اخاہ یہ آپ یہاں کہاں بیٹھ گئے آپ کا شمار تو مہمانوں میں نہیں گھر والوں چنانچہ آپ آئیے میرے ساتھ کھانا کھائیے گا۔ میں نے بھی نہیں کھایا ہے" چنانچہ انھیں اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھلایا۔

سیاسی معاملات میں دلچسپی شروع سے لیتے رہے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں اس میں شریک رہے پھر مسلم لیگ کے زمانہ عروج میں اس میں بھی پیش پیش رہے لکھنؤ کی مسلم لیگ کے صدر بھی رہے مگر اس کے ساتھ کسی دوسرے مذہب و ملت والے اور کسی سیاسی پارٹی سے مخالفت نہ مول لی۔ ان کی ملت پروری اور ملک دوستی کے درمیان ہرگز کوئی تضاد نہ تھا بلکہ جیسے گہرے تعلقات لیگ کے لیڈروں سے تھے ویسے ہی انھوں نے سر سیتارام، موہن لال سکسینہ، آچاریہ نریندر دیو وغیرہم سے بھی قائم رکھے اور اپنی مرنجاں مرنج طبیعت اور سلامت روی کے باعث کانگریسی حلقوں میں آخر تک مقبول و ممدوح رہے ـــــ

وقت آگیا تو جان ایک سچے مسلمان کی طرح جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آگئی کہ جب وقت مقررہ آجاتا ہے تو بڑے سے بڑا طبیب بھی اپنے کو ویسا ہی بے بس پاتا ہے جیسا کہ ایک عامی سے عامی انسان ـــــ پیدائش ۱۸۷۸ء کی تھی اس حساب سے عمر ۷۰ سال کی ہوئی۔

نئی نویلی

●

وہ ابھی بالکل نوجوان تھی. شادی کو پورا سال بھی ابھی کہاں گزرا. دس ہی گیارہ مہینے تو ہوئے. قریبی رشتے سے میری بھتیجی تھی اور دو ترجمہ قرآن پڑھنے میں شاگرد بھی. بڑی مذہبی بڑی صالح نماز کی عاشق روزے کی شیدائی سب کی ہمدرد، غمخوار، بڑی مخلص خدمت گزار. پہلا بچہ ہنستا کھیلتا پیدا ہوا. دوسری رات کو بیمار پڑی اور تیسری صبح کو قبل اس کے کہ آفتاب اپنے پورے عروج کو پہونچے اس کی عمر کا آفتاب غروب ہو گیا ناللہ. زچگی کی موت شہادت کی موت ہے سچے کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا پھر دفن کے وقت شب جمعہ شروع ہو چکی تھی. زبان پر آخر تک یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم رہا دوسروں سے سورۂ یاسین فرمائش کر کے پڑھوائی مردہ چہرے پر بجائے مُردنی اور بے رونقی کے رونق اور تازگی آنکھیں ذرا کھلی رہ گئیں، ان سے بجائے بدنمائی کے اور خوش نمائی اور زیبائی! نام ایک پیغمبر زادی کے نام پر "رقیہ" تھا. قبر میں باپ نے اُتارا. یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے —— اس جواں مرگ پیغمبر زادی کو بھی قبر میں اتارنے والے اُس کے والد ماجد اور اللہ کے محبوب ترین پیغمبر ہی تھے! اللہ اللہ امت کا باپ اپنے فرزندوں کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت کیسے کیسے سبق تسلی اور تعزیت کے اپنی زندگی کے دے گیا ہے.!

موت کا وقت عجیب پُر اثر، پُر درد تھا. لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب [illegible] نے

منقول از صدق: ۵ مارچ ۱۹۴۳ء

کے پرانے ممبر شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں ابھی آنکھوں کی پُتلی کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار باقی بھی ہیں! ـــ۔۔۔ گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتے کا ہاتھ پکڑ لیں گی ـــ ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس میں ہے کہ مصوّری ماں کے رنج کی کر سکے؟ لیکن رنج بحمداللہ مسلمان ماں کا تھا! ادھر غشی سے اٹھی ادھر سلسلہ پھر دعا و مناجات کا تکمیل دور قرآن شروع ہو گیا! اے اللہ تیری امانت تیرے سپرد یہ نعمت تو ہی نے دی تھی اور اسے واپس بھی لے لیا"! ـــ مسلمان عورت بھی جنّت کتنے ذریعوں سے لے سکتی ہے!

جسم رنجور، روح مسرور اب کوئی ہمیں پہچان نہیں پڑتا، مرنے والی نے ہراس و اضطراب سے نہیں سکون و اطمینان سے کہا سکرات شروع ہو چکا تھا بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی اور معاً زبان بھی بند ہو گئی ہونٹ دو بار اللہ اللہ کہنے کے لئے ہلے اور ایمان والی کی روح راضیۃ مرضیۃ کی بشارت پر دوڑتی ہوئی اڑتی ہوئی روانہ ہو گئی! ـــ اللہ کی جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد میں کسی حال میں غافل نہ ہوئی تھی جس نے نماز کو شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا کیسے ممکن تھا کہ مولیٰ کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی؟ کوئی اس یاد کی طرف دوڑ کر دیکھے تو وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟ ـــ فاذکرونی اذکرکم کی ایک نئی تفسیر عملی رنگ میں!

~~~~~~
~~~~~~

لکھنؤ کا مردِ بزرگ[1]

۲۸ر اکتوبر کو شب آخر ہو رہی تھی اور ۲۹ر کے طلوعِ فجر میں ابھی دو گھنٹہ کی دیر تھی کہ شہر کے ایک تہجد گزار اور شاید سب سے معمر مسلمان نے ۹۴، ۹۵ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے مراجعت اختیار فرمائی ۔۔۔ مولوی حاجی محمد نسیم صاحب بی، اے ایڈووکیٹ کے نام نامی سے آج سے ۵۰، ۶۰ سال قبل شہر لکھنؤ صوبہ اودھ میں کون پڑھا لکھا ناواقف تھا۔ اپنے زمانہ کے نامور ترین وکیل دیوانی تھے اور عین اس زمانہ میں جب کہ مقابلہ میں انگریز بیرسٹروں کے علاوہ نامی ہندو وکیلوں کی بھی معقول تعداد موجود تھی، مذہبی خیال کے ہمیشہ رہے، حالانکہ بی، اے اس وقت کیا تھا جب انگریزی تعلیم ہی شاید کفر و الحاد کے مرادف تھی جب بڑے صاحبزادے محمد وسیم بیرسٹر ایٹ لا کا کام خوب چل نکلا۔ اور پریکٹس کی طرح دینداری بھی ان کے حصہ میں آگئی تو خود کام چھوڑ کر تمام تر عبادت اور ذکر و شغل ہی میں مصروف رہنے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں علی برادران کے ساتھ حج کیا۔ اور زندگی کے آخری ۵۰ سال کہنا چاہیے کہ خدمتِ خلق و خدمتِ خالق ہی کی نذر کر دیئے ۔۔۔ شہر کی بڑی چھوٹی شاید ہی کوئی ایسی اسلامی تحریک ہوگی جو ان کی مالی امداد سے بار بار مستفید نہ ہوئی ہو۔ اور دینی رسالوں کو، علمی درسگاہوں کو، طلبہ کو، نادار عزیزوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو خفیہ و علانیہ جو کچھ دیتے رہے اس کا حساب کون لگا سکتا ہے۔

وسیع پھیلا اور لق و دق کوٹھی ڈالی باغ گویا ایک مستقل مہمان سرا تھی اور لکھنؤ کے ان چار پانچ مکانوں میں تھی جن کے دروازے چوبیس گھنٹہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی میزبانی

---

[1] (منقول از صدق، ۲۰ر نومبر ۱۹۵۳ء)

کے لئے کھلے رہتے تھے آج ٹرکی کے علمدار بے آئے ہیں کل حکیم اجمل خاں ٹھہرے ہوئے ہیں پرسوں
ڈاکٹر انصاری کا استقبال ہو رہا ہے، خلافت اور لیگ دونوں کے زمانہ عروج میں ہمدردیاں
ان کے ساتھ رہیں۔ وسیم مرحوم پاکستان چلے گئے اور وہاں کے ایڈووکیٹ جنرل ہو کر کوئی تین
سال ہوئے کراچی میں وفات پاگئے ــــ دو لڑکے نیشنلسٹ کیمپ میں رہے، ایک علی گڑھ میں
تاریخ و سیاسیات کے سینیر استاد ہیں دوسرے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ہیں حقیقی بھانجوں میں
ایک مشہور خلافتی اور کانگریسی ثم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں اس وقت مشرقی پاکستان کے
گورنر ہیں اور دوسرے ڈاکٹر سلیم الزماں کراچی میں غالباً کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر
ہیں ــ حفظ صحت کا بڑا خیال اور اہتمام رکھتے تھے چنانچہ باوجود ضعیف الجثہ ہونے کے
آخر عمر تک صبح کی مشی (ٹہلنے) کی عادت قائم رکھی، ہوش و حواس میں ذرا فرق آگیا تھا مگر نہ ایسا
کہ بہت نمایاں ہو۔ زندگی کی آخری شب حسب معمول نماز عشاء کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے سو
گئے۔ ڈھائی بجے شب کو طبیعت پھر بے چین ہوئی نرس نے گولی دی ذرا سکون ہوا ۴ بجے کا وقت
تھا تیمار دار لڑکی نے کہا کہ آج آپ نے تہجد کی نماز نہیں پڑھی تیمم کا پیالہ مانگا اس پر مارنے
کے لئے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ہاتھ بے کار ہو گئے ایک ہچکی آئی اور طائر روح سیکڑوں ہزاروں
بندگان خدا کی دعاؤں کی جھرمٹ میں اعلیٰ علیین کو روانہ ہو گئی ــــ مرد بزرگ عمر ہی
ہی کے اعتبار سے بزرگ نہ رہا حسن خاتمہ کے لحاظ سے بھی بزرگوں تک کے لئے قابل رشک نکلا
نماز جنازہ مولانا عبدالشکور صاحب نے پڑھائی، اور تدفین خاندانی قبرستان میں قصبہ گدھی
مٹولی، ضلع بارہ بنکی میں ہوئی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

"مردِ مومن کی وفات"

یو۔پی کونسل کے سابق اور بہت قدیم ممبر اور یو۔پی کونسل کے سابق نائب صدر حاجی شیخ مسعود الزماں رئیس اور بیرسٹر (باندا) ۳۰ جنوری ۵۸ء کو عین نماز فجر کے وقت دنیا سے رخصت ہوئے اور اس انوکھے انداز سے کہ گویا سفر آخرت پر نہیں، بلکہ یہیں کہیں کے سفر پر خدا حافظ کہتے اور سلام کرتے ہوئے رخصت ہوتے رہے ہیں!۔ مومن کے نفس مطمئنہ کے لئے بھی مالک و مولا کی طرف سے راہیں بے شمار کھلی ہوئی ہیں!

مدیر صدق کے قریب ترین عزیزوں میں سے تھے اور کالج میں اس کے ساتھ دو سال پڑھے ہوئے بھی۔ انگریزی ترجمہ و تفسیر کے کام کا جب آغاز ہوا، تو اپنا ٹائپ رائٹر نذر کیا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے کتب خانے سے انگریزی کی بیش قیمت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا گیارھویں ایڈیشن، کی پینتیس ۳۵ ضخیم جلدیں بھی فراخدلی کے ساتھ پیش کریں! بڑا ارقیق قلب رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ارادت والہانہ۔ نعتیہ مضمون سن کر رو پڑتے نماز کے تو خیر پابند تھے ہی روزے فرض کے علاوہ بھی بڑے شوق سے سال میں کئی بار رکھ لیا کرتے تھے۔ حج ادا کر آئے تھے اور اب دوبارہ جانے کے خیال میں تھے زکوٰۃ کے مسائل کا گہرا علم رکھتے تھے اور ادائے زکوٰۃ کے بڑے سرگرم ساعی صوبہ کونسل میں بار بار زکوٰۃ کے بل کے نام سے قانون صوبہ کے سارے مسلمانوں کے لئے پیش کیا کئے۔ سیرتِ دائی کے نام سے ایک کتاب بھی سیرۃ النبی پر غیر مسلموں میں تبلیغ کے نقطہ نظر سے لکھی اور چھپوائی ——— اچھے خاصے شگفتہ دل بشاش تھے کہ قبل فجر بڑے تڑکے کو چکوا کر بلوایا

منقول از صدق جدید ۷ فروری ۵۸ء

اور بولے کہ بیٹا ہم رخصت ہو رہے ہیں خدا حافظ۔ ڈاکٹر فوراً بلائے گئے اور وہ اطمینان دلا کر چلے گئے۔ تنفس شروع ہو چکا تھا۔ اب ایک لڑکے سے کہا کہ قرآن مجید سناؤ۔ پھر خود بھی پوری آواز سے سورۂ المزمل شروع کی۔ پڑھی اور اس کے بعد کلمہ پڑھتے ہوئے انگشت شہادت اٹھائی اور کہا "گواہ رہنا"۔ معاً ہچکی آئی اور طائر روح قفس خالی کر کے پرواز کر گیا۔ ایک لڑکے نے جب آیۃ الکرسی سنائی تو خوش ہو گئے بولے کہ آج کمائی وصول ہو گئی۔ ایسی مومنانہ موت پر رشک کس کو نہ آئے گا؟

چودھری سمیع الزماں مرحوم

○

نوٹ لکھے جا چکے تھے کہ لکھنؤ کے حاجی شیخ سمیع الزماں کی وفات کی خبر (۱۶ اپریل) معلوم ہوئی۔ لکھنؤ میں ایک خاندان قصبہ بجنور کے شیخ زادوں صدیقی کا آباد ہے جس کا شمار لکھنؤ کے عمائدین میں ہے اور شہر میں اس کا خاص اثر رہا ہے۔ مشہور سیاسی لیڈر چودھری خلیق الزماں اسی خاندان کے ہیں اور مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مرحوم کو آرٹ سے خاص دلچسپی تھی اور دستی تصویر کشی میں خاص شہرت حاصل کر لی تھی۔ مرحوم کے حقیقی ماموں حاجی محمد نسیم مرحوم لکھنؤ کے نامور ایڈوکیٹ تھے اور ماموں زاد بھائی مسٹر محمد وسیم مرحوم بیرسٹر پاکستان جا کر وہاں کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل مقرر ہوئے۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر سلیم الزماں بہ حیثیت ایک سائنٹسٹ کے پاکستان ہی میں نہیں دنیا کے سائنسی حلقہ میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب لکھنؤ میں سردار خاندان یہی تھے اور عمر کوئی ۸۵-۸۶ کے درمیان رکھتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

منقول از صدق جدید ۲۵ اپریل ۱۹۶۹ء

ایک خدمت گار کی یاد میں

خدمت گار! یہ طبقہ بھی بھلا اس قابل ہے کہ "میاں لوگ" اس کا ذکرِ خیر اپنی مجلسوں میں لائیں۔ چہ جائیکہ اخبار کے صفحہ میں یہ تذکرے بار پائیں! غلامی کی رسم اب ضابطہ سے شاید مٹ چکی ہے لیکن عملاً برتاؤ کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے نوکر چاکر خصوصاً گھروں کے پروردے ٹھیک اسی جگہ ہیں جو روسا میں غلاموں اور پشتینی غلاموں کیلئے مخصوص تھی۔ ایرانی اور ہندی تہذیب کے دو آتشہ نے مخدوم و خادم آقا اور چاکر کے اس بین المشرقین فرق کو کم نہیں کیا ہے اور بڑھا دیا ہے۔

حاجی محب علی مرحوم ہمارے گھر کے پروردہ تھے (یہ اصطلاح شاید دوسرے ملک والوں کی سمجھ میں نہ آسکے) ان کے والد نے ہمارے ہی ہاں کی ملازمت میں انتقال کیا۔ ان کی ماں یہیں پلیں، بڑھیں بوڑھی ہوئیں۔ اور ابھی زندہ ہیں۔ محب علی کی پیدائش کے وقت سے گویا وراثتہ ہماری ملک ہو گئے — میاں لوگوں کی دنیا میں سلطان ابن سلطان کی طرح آقا ابن آقا اور خادم اسی طرح نسلاً بعد نسل ہوتے چلے آئے ہیں۔

پیدائش سنہ ۱۹۰۱ء کی عمر کے ۵۰ سال ہماری ہی ڈیوڑھی پر ادنیٰ معاوضہ پر گزار دیئے انتہائی اخلاص، دیانت داری، وفاداری، ہوا خواہی اور "نمک حلالی" کے ساتھ (یہ آخری لفظ بھی آقاؤں اور آقازادوں کے لغت کا ہے) جان ۲۲ر رمضان (۲۷ جون) یوم چہارشنبہ کی شام کو ۸ ۱/۲ بجے جب مسلمان عشاء کی اذانیں دینے اور تراویح میں قرآن سنانے میں لگے ہوئے تھے، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ خدمت گار کا آقا صرف ایک نہیں ہوتا گھر کی مالکہ، آقازادوں اور آقازادیوں ان کے بھائی بھتیجوں سب کی رضاجوئی یکساں اس پر واجب ہوتی ہے — اس امتحان میں پورا اترنا پہاڑ سے دودھ کی نہر سہارٹ کرلانا ہے۔

صدق جدید ۶ر جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

بیماری ضعفِ معدہ کی لاحق ہوئی یا آج کی زبان میں اسٹرو بی کی دق، عمر آزما شدائد اور جان گسل تکلیفوں میں پھیپھڑوں کی دق سے ذرا کم نہیں۔ وہی پور پور میں شدید درد، وہی رگ رگ میں کھنچاؤ، وہی بیتاب کر دینے والی اندرونی سوزش، وہی تڑپا دینے والی جلن چبھن، وہی انتہائی ضعف و لاغری، وہی آخر میں دم بدم دستوں کا بلا اختیار چلے آتے رہنا اور جسم کا گوشت گل کر صرف ہڈیوں کا ہار باقی رہ جانا! غریب محب علی نے ساری تکلیفیں ایک ایک کر کے جھیلیں دو چار دن نہیں، مہینوں جھیلیں مدت سے صحت کے بجائے موت کی تمنا کرنا شروع کر دی تھی۔ ادھر تیمار دار چوبیسوں گھنٹوں کی ڈیوٹی سے الگ عاجز آ گئے تھے عبرت کے قابل تھا یہ منظر کہ ایک اچھی چوڑی چکلی ہڈیوں کا اپنی جوانی میں کشتی لڑا ہوا۔ نفاست پسند اور بڑا صاحب تدبیر مستعد کارگزار انسان چارپائی پر معذوری، بے کسی اور بے بسی کی تصویر بنا ہوا پڑا ہے پٹی سے متصل چلمچی والی رکھی ہوئی ہے اور پاٹ لگا ہوا ہے اور مریض بغیر کسی کے سہارے کے کروٹ لینے پر قادر نہیں!

۱۲ رمضان آخر وقت عصر میں جب نزع شروع ہوئی تو میں نے سب سے پہلے پہچانا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور تنفس بگڑ چکا تھا۔ الجھن بے انتہا بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ تسکین یاسلام پڑھنے سے ہوگی آواز سے نہ پڑھا جا سکے تو اندر اس کا ورد رکھو خود بھی کئی بار پڑھ کر دم کیا ہاتھ سرد ہو چکے تھے۔ پیروں میں کچھ گرمی باقی تھی ایک طبیب کو بلا کر دکھایا انھوں نے کہا کہ نبض بال کی سی باریک چل رہی ہے۔ بعد مغرب سوئے تنفس نمایاں ہو گیا۔ عورتوں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور لب مرگ مریض کے کان میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہوش و حواس سب بالکل درست تھے۔ ایک عزیز سرہانے کھڑے کہتے گئے کہ یہ ماں ہیں یہ بیوی ہیں اور وہ ایک ایک کے لئے لفظ معافی زبان پر لاتے گئے۔ آخر میں مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب بیٹھے ہیں اس پر اپنا سوکھا ہوا لیکن متورم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ "معاف کیجئے گا"۔ میں نے ہاتھ دبا کر اور رو رو کر کہا کہ معافی تو دونوں طرف سے ہونا چاہئے میں نے معاف کیا تم بھی معاف کر دو۔ ایک حافظ نے سورہ یٰسین شروع کر دی اور چند منٹ کے اندر روح جسم کا ساتھ بالکل چھوڑ

گئی چہرہ خود بخود قبلہ رو ہو گیا۔

ساری رات گزری جس طرح گزری غسل وغیرہ کا انتظام صبح شروع ہوا جب تختہ پر لٹایا اور سب کپڑے اتار لیے گئے تو آنکھوں نے اس جسم کا نظارہ کیا جو سوکھ کر محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ (جیسا کہ ڈاکٹری کتابوں میں اناٹومی کے نقشے ہوتے ہیں) اور زبان اپنے کو نہ روک سکی پکار کر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا کہ یہ وہی چہرہ ہے جو ابھی کل تک ساری قوتیں ساری توانائیاں ایک میری خوشنودی کے لئے وقف کئے ہوئے تھا خود بڑی بڑی بے چینی اٹھا کہ میں نہ بے چین ہونے پاؤں۔ یہ ہاتھ وہ ہیں جو چوبیس گھنٹے میری ہی خدمت کے لئے وقف رہتے تھے ان پر بچپن میں خدا معلوم کتنی بار قمچیاں پڑی ہوں گی اور آج بھی کتنی بار ان کا بیجا استعمال میری ذات سے ہوا ہوگا۔ اور یہ سوکھی ہوئی ٹانگیں اور پنڈلیاں اور یہ متورم پیر خدا معلوم کتنی بار میری وجہ سے دوڑے ہوں گے تھکے ہوں گے۔"

آج اصل منظر سے بہت دور بالکل بے تعلق یہ کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ کچھ بے جان سے نظر آرہے ہوں گے عین موقع پر ان کا درجہ قال کا نہ تھا حال کا تھا۔

غسل کا اصل کام میرے حقیقی خالہ زاد بھائی نے انجام دیا وضو کا وقت آیا تو اعضائے وضو پر پانی میں خود ڈالتا گیا اور رو رو کر جس طرح دعا مظلوم و مرحوم خادم کی مغفرت کے لئے کرتا گیا اسی طرح اس کے زندہ ظالم آقا کے لئے بھی ــــ دل نے کہا کہ جنت میں خادم مخدوم کہاں وہاں تو سب مخدوم ہی ہوں گے۔ تاہم یہ شخص جو دنیا میں مجھ پر اتنی جان چھڑکتا رہا۔ اور اس طرح یہ جذبہ اس کی فطرت میں راسخ ہو گیا ہے کہ عجب نہیں جو یہ حقیقت میں کبھی (اگر اللہ نے وہاں اپنے کرم بے حساب سے پہنچا دیا) اپنے کو میری خدمت ہی کے لیے پیش کرنا رہے۔

کفن پہناتے وقت جب کفنی میں نے گردن میں ڈالی ہے تو یہ یاد آیا کہ زندگی میں بے شمار بار اس نے میرے کپڑوں کی دیکھ بھال رکھی ہے آج ایک بار تو عالم ناسوت میں اس کی یہ آخری خدمت کر لوں۔ نماز اور تدفین سب ویسی ہی ہوئی جیسی ایک مسلمان کی ہوتی ہے۔ بڑی تمنا مرحوم کو اس کی

تھی کہ جمعہ کا دن نصیب ہو۔ اللہ نے یہ تمنا پوری کر دی کہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ عنایت
کیا (عتق من النار) کا وعدہ یاد کر لیجئے آگ سے تمام تر آزادی مخلصی!) اور تدفین ایسے وقت
ہوئی کہ قبر میں پہلی رات وہی جمعہ کی رات اور شب قدر کی ایک رات (۲۷ویں شب) اکٹھی
مل رہی تھیں پھر دق کے مرض میں شہادت کی بشارت تھی اس کے علاوہ اب اس اخلاص محض
کو آنکھیں عمر بھر ترستی رہیں گی۔

ترا عاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد!

عُلماء کرام و بزرگانِ طریقت

قطب ارشادؒ کا وصال

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا۔ آخر جولائی کی غالباً ۱۴ر تھی کہ میرے بھتیجے کا خط تھانہ بھون سے حسب ذیل وصول ہوا۔

"یہاں پہونچ کر واقعی حضرت کی طبیعت بہت زائد علیل پائی۔ نماز جمعہ کے قبل سے لے کر مغرب تک مسلسل غفلت و غنودگی طاری رہی اور حضرت قدس مخصوص حضرات سے بھی مخاطب نہ ہوئے۔ اسہال کی شکایت قبل ہی سے تھی۔ مگر پرسوں سے غفلت اور غنودگی بھی شروع ہو گئی ہے۔

میرا ذکر ایک بار مولانا کے خادم خاص سلیمان نے قبل نماز جمعہ کیا، مگر حضرت غافل ہو گئے۔ نشست کے وقت مولوی جمیل صاحب نے میری اور دوسرے لوگوں کی اطلاع کرنا چاہی مگر اس وقت سے لے کر مغرب تک حضرت مسلسل غافل رہے۔ اسی لیے حاضری سے محرومی رہی۔ اللہ صحت دے۔ بعد مغرب خواجہ صاحب نے میرا ذکر کیا حضرت نے میرا نام لیا اور پوچھا کہ اس وقت موجود ہیں؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ نشست کے وقت تو تھے۔ فرمایا کہ اس قابل کہاں کہ کسی سے گفتگو کر سکوں یا متوجہ ہو سکوں اس کے بعد حضرت غافل ہو گئے۔ میں نے خط پڑھتے ہی کہا کہ خدانخواستہ یہ بیماری ہی اور ہے۔

رنجش از سودا و از صفرا نبود — بوئے ہیزم پدید آمد ز دود

طبیب اپنی مادی اصطلاحوں میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کر رہے ہیں یہ

صدق ۲ر اگست ۱۹۴۳ء

توسب سامان خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ دیکھوئی کے معلوم ہو رہے ہیں اور یہ عارضی و وقتی غیبت تمہید نظر آ رہی ہے۔ طویل اور ناسوتی، معیار سے ابدی غیبت کی! ـــــــ ص۱۲ میں ایک نوٹ اس کے قبل دیا جا چکا تھا ص۱۳ میں دوسرا نوٹ اس خط کی بنیاد پر دیا گیا! دل و زبان دعاؤں میں لگ گئے ـــــ دعائیں اپنے ہی مفاد کے خاطر اور اپنی ہی خود غرضی کی بنا پر ـــــ خود حضرات مولانا پر اب مراسلت کا بار ڈالنے کا کیا موقع تھا وصل بلگرامی بہت یاد آئے ـــ وہ ایسے موقعوں کے لیے بہت موزوں تھے اب خود ہی مرحوم ہو چکے ہیں، خیر بعد غور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز (مولانا کے عاشق زار اور خلیفہ خاص) تھانہ بھون کی خدمت میں خط بھیج کر درخواست کی گئی کہ حالات کی جلد جلد اطلاع پہونچتی رہے۔ اپنے خط کی عبارت اب کہاں یاد، البتہ ایک فقرہ یہ یاد ہے کہ " اللہ سے دعا ہے کہ حضرت کی موت حیات کو ہم نیاز مندوں کی مرضی پر چھوڑ دے "! ۷ رجولائی کی دوپہر کو عین انتظار میں خواجہ کا کارڈ ۲ ار کا لکھا ہوا پہونچا۔

" والا نامہ شرف صدور کی پایا حضرت کی خدمت میں پہلے خلاصہ پھر بعینہٖ زبانی پیش کیا ـــ فرمایا " یہ آپ کی محبت ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے "۔ جناب حکیم حافظ عبدالمجید صاحب لکھنوی کا علاج بدھ سے ہے بفضلہ تعالیٰ افاقہ کی صورت معلوم ہو رہی ہے گو ابھی عوارض موجود ہیں۔ بالخصوص ضعف بے انتہا ہے۔ غذا رحم سے نہیں ہوئی تھی۔ کل سے بشیر کا آبجوش شروع ہوا ہے خدا کرے روز بروز صحت و قوت ہوتی چلی جائے۔ اسی حالت میں بھی وہی احساسات، وہی انتظامات وہی ضروری امور میں تنقیحات و تدقیقات موجود ہیں جن سے سب کو حیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس چشمۂ فیض کو ہمیشہ جاری رکھے۔ آپ نے اپنی دعا میں جو صیغہ ارقام فرمایا ہے وہ درحقیقت ہم سب کے قلوب کی ترجمانی ہے ان شاء اللہ حسب ہدایت خیریت سے مطلع کرتا رہوں گا۔"

اس خط سے ایک آن کی آن دل کو ڈھارس ہوئی ٹوٹی ہوئی امید ذرا کی ذرا بندھی ...

شاید کہ امت محمدیہ کو وقت کی اس نعمت عظمیٰ سے فائدہ اٹھانے کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔

کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا۔ ساعت موعود ابتی قریب آگئی تھی آفتاب علم وعرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں، اللہ کی رحمت ناا ہلوں اور ناقدرے لوگوں سے واپس لی جا رہی تھی۔ رسول اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک و مولیٰ کے دربار میں حضوری کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ لشکر اسلام کا سب سے جرنیل دین کے ہر ہر محاذ پر ہر ہر معرکہ، ہر ہر مورچہ کا دلاور اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چور چور کئے ہوئے، قلب خاشع و نفس مطمئنہ کے ساتھ عالم ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گذر رہا تھا۔ ۲۳ جولائی کو لکھنؤ سے ایک عزیز کا خط ۲۲ جولائی کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا۔

"شب کو بعد عشاء خبر ملی کہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادھر افاقہ کا حال معلوم کرکے اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم بے راہ روؤں کے سنبھالنے کا یہ ستون ابھی کچھ دنوں کے لئے قائم رہنے دیا ہے۔ مگر آہ کہ وہ کل مدت دو ہی تین دن میں ختم ہو گئی۔ عمر شریف اور ضعف کی زیادتی نے افاقہ کی خبر کے باوجود بھی حالات کی اطلاع علمی خبر سننے کے لئے ایک حد تک تیار کر چکی تھیں اس پر بھی اتنا سخت تھا کہ قلب میں ایک دھکا سا لگا اور کچھ دیر تک قلب و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہی۔ زبان سے تو حسب عادت انا للہ کہہ دیا لیکن دیر تک نہ سمجھ میں آیا کہ کیا کیا جائے۔ بعد میں دعائے مغفرت و بلندی مراتب کے لئے کی۔ لیکن بار بار یہ بھی خیال آتا رہا کہ ایسی ہستی کے لئے کہ ایسی ہستی کے لئے یہ چیزیں تو گویا یقینی ہیں، پھر ان کی کیا ضرورت۔ لیکن پھر اس کے اور ایصال ثواب کی دوسری صورتوں کے علاوہ کیا کیا جائے؟ چنانچہ کئی بار دعا کر چکا ہوں۔ چند اجزائے قرآنی پڑھ کر بھی ایصال ثواب کیا۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آہ کہ طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی بنیاد

کیسی ریت پڑگئی! اور بشری تدبیر نے خداوندی تقدیر کے مقابلہ میں کس بری طرح شکست کھائی! مولانا میرے اُستاد تھے، معتدا تھے، سردار تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے، آہ! کہ عقیدت، عظمت، محبت تینوں ایک ہی وقت میں کچل کر رہ گئیں۔ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں، کسی دوسرے سے کیا تعزیت کروں ــــــ اللہ نے ان کی ذات میں نور حق کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ ولی کامل کا نمونہ اس بیسویں صدی میں دکھا دیا تھا۔ ؎

ما شما را نور مطلق دیدہ ایم
نور مطلق را ہمہ حق دیدہ ایم

دین کے خادم اور بزرگ ان بھی اس وقت اچھے اچھے موجود ہیں پر وہ ایک ہستی ان سب سے نرالی ان سب سے انوکھی اپنی نظیر بس آپ تھی۔! ع

عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں
ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اللہ کے اس ولی کے حق میں دعائیں کرانا اس کا نہیں اپنا مرتبہ بڑھانے کے لئے ہیں۔ ؎

"سجدوں سے اور بڑھتی ہے رفعت جبین کی"

درود خوانی سے مرتبہ رسول اکرم صلعم کا نہیں بڑھتا خود اپنا ربط و تعلق اس ذات اقدس کے ساتھ زیادہ گہرا اور راسخ ہوتا ہے۔

راقم کے لئے اپنی عمر کا اب جتنا بھی حصہ باقی ہے، مولانا قدس اللہ سرہٗ کے مناقب و فضائل کے بعض گوشوں پر انشاء اللہ حسب توفیق ان صفحات میں گذارشیں پیش ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تو مقصود محض خبر کو ناظرین تک پہونچانا تھا۔ ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جاں عزیز

عبدالرحمٰن کی موت[۱]

پہاڑی اور پہاڑی غاروں میں پتھر کے ٹکڑوں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج ہوتی ہوئی ہے جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ہی میں کوئی سنگریزہ لعل یا قوت بن کر نکل آتا ہے۔ جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے، تو دل پر کیا گزر جائے گی ؟ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے ہوتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوش صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا! جنگل میں خودرو بیل اور پتے درخت اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں لیکن گلاب کی تازہ و شاداب کلی بزم ہستی کو معطر کرنے کے لئے ہوتی ہے یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا... اور قابو میں رکھا جا سکتا ہے ؟

ایک چراغ جلا، لیکن قبل اس کے کہ اس کا اجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا! ایک آفتاب چمکا، لیکن پیشتر اس کے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں غروب ہو گیا۔ ایک پھول کھلا مگر معاً مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر فوراً خشک ہو کر زمین کے برابر ہو گیا۔ حق کی

۱۔ سچ ۱۹ مارچ ۱۹۲۶ء

ر طبند ہوئی۔ لیکن معاً فضائے لامتناہی میں گم ہوگئی۔ عبدالرحمن ننگرامی نے ۲۷-۲۸ سال ہوئے
صورت کے ظلمتکدہ میں اپنی آنکھیں کھولیں لیکن یہاں کی فضا کو شاید اپنے غیر موافق پاکر
ارچ ۱۹۲۶ء ۱۲ شعبان ۱۳۴۲ھ کو صبح کے وقت تعین اطلاق میں محدود غیر محدود
مقید مطلق میں قالب بے قالبی میں جسد عالم جان میں جذب و گم ہوگیا۔ سچ کہا ہے
کہنے والے نے کہ ہم سب اسی کے ہیں اور سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

صورت از بے صورتی آمد بردن
باز شد انا الیہ راجعون

میں اشکبار، کہ عالم انسانیت کے اس جوہر آبدار کو اب کہاں تلاش کریں قلب مضطرب
نات آب و گل کے اس گوہر بے بہا کے بغیر کیوں کر آرام پائے عقل حیران کہ گلشن
ی کے اس گل رعنا کو کہاں سے ڈھونڈھ نکالا جائے۔ لیکن غیب کا فرشتہ آواز دیتا
کہ اس قید خانۂ عنصری میں صرف اسی وقت تک کے لئے روحوں کو مقید رکھا جاتا
جب تک کہ وہ اپنی تربیت تمام حاصل کر لیں۔ عالم معنی میں زمانہ کا شمار، انسان کی
ی ہوئی جنتری اور آفتاب کی گردش سے نہیں ہوتا بلکہ روح کے لئے واپسی
وقت مقررہ" وہی ہے جب وہ اپنی تربیت کی تکمیل کرے۔ پس اگر اس پاک وصف
کیزہ سرشت ہستی نے جس کا ناسوتی نام عبدالرحمن تھا اتنی کمسنی میں تکمیل روح
مارے مدارج طے کر لئے تھے تو ٹھیک اسی "وقت مقررہ" پر اس کا اپنی اصل کی
ف رجوع کرنا لازمی تھا جس پر حیرت کرنی بیجا اور رنج و تاسف کرنا بے محل ہے۔

دنیا کی ظاہر بین نگاہیں اس مرنے والے کے خط و خال سے زیادہ مانوس نہ تھیں
اگر اس مرحوم کے فضائل و کمالات کو پھیلا کر بیان کیا جائے تو یقیناً بہتوں کو
نہ کا شک گزرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ان سے ذاتی نیاز حاصل
ی بدنصیب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ذات کے اٹھ جانے سے امت اسلامیہ کیا

لکھو بیٹھی، میں مرحوم کو اس زمانہ سے جانتا ہوں جب وہ دار العلوم ندوہ کی شاید کسی نیچی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اور ان کی عمر ۱۵۔۱۶ سے زائد نہ تھی۔ تقریر کا شوق انھیں اسی وقت سے تھا اور قیصر باغ لکھنؤ میں جب پہلی بار میں نے ان کی تقریر سنی اتنی بلند و برتر تھی کہ قدرۃً یہ بدگمانی پیدا ہوئی کہ کسی نے یہ تقریر قلمبند کر کے پیشتر سے حفظ کرادی ہے ورنہ اتنا کم سن طالب علم ایسی برجستہ تقریر کر نہیں سکتا۔ مگر جوں جوں سابقہ بڑھتا گیا یہ بدگمانی دور ہوتی گئی اور اس آئینہ کے اصل جوہر کھلتے گئے۔

ندوہ میں تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک زمانہ تک سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح میں اتالیقی کے فرائض انجام دیئے۔ مولوی امین احسن اصلاحی جن کے مضامین سچ کی پہلی جلدوں میں بکثرت شائع ہو چکے ہیں اسی دور کے شاگرد ہیں) مدرسۃ الاصلاح اپنے رنگ کی سارے ملک میں بہترین تربیت گاہ ہے سادہ ترین معاشرت کے ساتھ اعلاترین علم اخلاق سے مسلمانوں کے بچوں کو آراستہ کرنا اس کا مقصد ہے۔ جناب مولانا حمید الدین صاحب مدظلہ العالی صاحب تفسیر قرآن نظم القرآن اس کے سرپرست و نگراں اعلیٰ ہیں اور مرحوم ان کے بہترین رفیق و مددگار تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں خصوصاً یتیم اور بے والی و وارث بچوں کو جس شفقت و محبت کے ساتھ مرحوم تربیت دیتے تھے اس کا نمونہ میری نظروں سے کم گزرا ہے۔

غالباً ۱۹۲۰ء میں مولانا ابوالکلام کی طلب پر مرحوم کلکتہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اس اسلامی دار العلوم میں جو سرکاری امداد سے بے نیاز رہ کر کھولا گیا تھا صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ اس کم عمری میں اتنی بڑی ذمہ داری کے عہدہ پر انتخاب ہو جانا اور پھر اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دینا۔ مرحوم کی ایک مخصوص فضیلت تھی۔ یہ زمانہ تحریک خلافت و ترک موالات کے شباب کا تھا۔ اور مرحوم نے علاوہ اپنے مشاغل تعلیم و تدریس کے ان اجتماعی و قومی تحریکات میں پوری قوت جوش و سرگرمی کے ساتھ

حصہ لیا، بہ کثرت تقریریں کیں۔ اور متعدد مضامین مسائل حاضرہ پر سپرد قلم فرمائے۔
۱۹۲۱ء کی آخری سہ ماہی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی اور مولانا عبدالرزاق ندوی
کی ایڈیٹری میں پیغام نام سے ایک ہفتہ وار کلکتہ سے نکلا۔ مرحوم نے اس کے اداریے
برابر ملکی آزادی کے مسئلہ کو شریعت و قرآن پاک کی روشنی میں پیش کیا۔

غالباً شروع ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ
مستقل طور پر آ گئے اور دار العلوم ندوہ نے اپنے یہاں ادب کی خدمت پر انھیں مامور
کیا۔ قرآن کا ذوق فطرت میں داخل ہو چکا تھا ہر شاگرد کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ
کر شفقت تھی۔ متعدد شاگردوں کو ذرہ سے آفتاب بنا دیا۔ دار العلوم ندوہ کی جو
اصلی روح تھی۔ اسے از سر نو زندہ کر دیا اور بہت سے سینوں میں قرآن کی خدمت اور
اسلام کی محبت کا سوز پیدا کر دیا۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کی ہر اصلاحی تحریک میں خلوص قلب
کے ساتھ حصہ لیتے رہے، تبلیغ، تنظیم، خلافت، ندوہ، کانگریس اور ہر تحریک میں جو امت
اسلامیہ کے لئے مفید معلوم ہوئی۔ بہ قدر استطاعت پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت فرمائی
لکھنؤ میں ۱۹۲۴ء کے ہندو مسلم فسادات کے موقع پر اور ۲۵ء میں فتنہ شدھیہ کے
وقت خطرہ میں پڑ کر انتہائی حق پرستی کا عملی ثبوت دیا۔ ۲۵ء میں جون پور کے
ہندو مسلمانوں میں صلح کرائی۔ مارچ ۲۵ء میں لکھنؤ کے اور نومبر ۲۵ء میں انبالہ
کے اجلاس ندوہ میں مقاصد ندوہ پر جو اعلیٰ تقریریں ارشاد کیں وہ گویا اس وقت بھی
کانوں میں گونج رہی ہیں۔ انبالہ والی تقریر غالباً زندگی کی سب سے آخری تقریر تھی
علالت اس وقت شروع ہو چکی تھی تقریر بہت دیر جاری نہ رکھ سکے تھے۔ اکتوبر ۲۵ء
میں رفاہِ عام لکھنؤ میں توفیق شریف کی عربی تقریر کا جس برجستگی و شستگی کے ساتھ اردو
ترجمہ کیا اس نے مخالفین تک کو داد دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چند شوریدہ سروں کو اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی تھی۔

سنہ ۱۹۲۲ء کی آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک صاحب کی مستعدی سے یہ دشواری ایک حد تک حل ہو گئی۔ ۱۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو دفتر سچ میں چار شخصوں کی ایک مختصر مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پا گئے اس مختصر مجلس کے ایک اہم رکن خود مولوی عبدالرحمن تھے۔ عام مقاصد سے ہمدردی و اتفاق رکھنے والے متعدد احباب تھے لیکن یہ اسی وقت نظر آ گیا تھا کہ اکثر عقائد و خیالات کے جزئیات تک میں جو موافقت عبدالرحمن کو عبدالماجد کے ساتھ ہے وہ شاید کسی دوسرے عنایت فرما کو حاصل نہیں۔ اور شرکت تحریر میں جو سہولت مرحوم کے ساتھ حاصل ہو سکتی تھی اس کی توقع کسی اور سے نہیں۔ بعد کے تجربہ نے اس توقع کو حرف بہ حرف ثابت کر دیا ایک سال سے کچھ اوپر کے طویل سابقہ میں مرحوم کے طرز لہجہ تحریر سے صرف ایک بار (جلد اول نمبر ۱۵ میں ایک مضمون کے عنوان اور اس کے بعض لفظ کے تعلق) مجھے اختلاف ہوا اور جب میں نے اپنی اس رائے کو ان پر ظاہر کیا تو اس بے نفسی کے ساتھ جو ان کے بعد میرے لئے اب خواب و خیال ہے انھوں نے بلا تامل و توقف میری گزارش کو تسلیم فرما لیا۔ سچ میں اپنے مضامین کے ذریعہ سے اسلام و امت اسلامیہ کی جو خدمت وہ انجام دیتے رہے اس کی پوری روئداد ناظرین کے سامنے ہے۔

پہلے چند ماہ سے پیروں کے درد میں مبتلا رہنے لگے تھے جسے ہم لوگ وجع مفاصل کے قسم کا کوئی مرض سمجھتے رہے اور چونکہ خود مریض نے اپنے صبر و متانت کی بنا پر کبھی مرض کی شدت نہیں بیان کی اسی لئے قدرۃً اسے معمولی اور غیر اہم سمجھا کئے۔ علاج کا سلسلہ جاری رہا لکھنؤ اور نگرام (ضلع لکھنؤ) میں متعدد اطباء کے علاج کے بعد بہرائچ ایک عزیز کے یہاں علاج و تبدیل آب و ہوا دونوں کی غرض سے تشریف لے گئے مسہل ہوئے افاقہ محسوس ہوا، چنانچہ ان کے آخری مکتوب میں انھیں کے قلم سے افاقہ کی خبر پڑھ کر سچ (نمبر ۱۱) میں میں نے ان کے متعلق کسی قدر اطمینان بخش نوٹ دیدیا تھا۔ اور ناظرین سے ان کی صحت کے لئے دعا چاہی تھی۔ عین اسی روز جب کہ وہ نوٹ طبع ہوا اسی صبح کو نماز فجر کے فوراً

بعد خاک کا پتلا، مرض و صحت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے نجات پا کر رفیق اعلیٰ سے جا ملا اور اپنے تمام دینی بھائیوں پر بجائے دعاء صحت کے دعاء مغفرت کا حق قائم کر گیا۔ اِنّا للہِ وانا الیہ راجعون۔

دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں کی جماعت کثیر سے قطع نظر کر کے اپنے خاص عزیزوں میں مرحوم نے ایک نوجوان بیوہ ایک خورد سال بچّی اور ایک دل شکستہ ماں کو چھوڑا ہے۔ ماں کی سرگزشت خصوصیت کے ساتھ دردناک ہے۔ کم سنی میں بیوہ ہوئیں بجز خورد سال عبدالرحمان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ساری عمر اسی نونہال کے پروان چڑھانے میں بسر کر دی۔ یہاں تک کہ مادی زندگی کا بڑا سہارا بھی دغا دے گیا۔ ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لئے بدنصیبی نہیں انتہائی خوش نصیبی ہے۔ سارے سہارے مٹ کر صرف ایک ہی سہارا باقی رہ جائے اور سب سے رشتہ ٹوٹ کر صرف ایک ہی سے رشتہ جڑا رہ جائے۔

حسن عمل اب بھی مسلمانوں سے بالکل رخصت نہیں ہو گیا ہے۔ سرزمین ہند کے گوشوں اور زاویوں میں ابھی بعض بڑے بڑے زاہدانِ شب بیدار موجود ہیں۔ قومی کام کرنے والوں ہی کی جماعت میں بھی ابھی چند نہایت اور مخلص اور پختہ ایمان جوان مرد زندہ ہیں۔ لیکن اگر میری دیانت سے یہ سوال کیا جائے کہ اب تک سب سے زیادہ معصومانہ زندگی لغزشوں اور آلائشوں سے پاک زندگی، بچّوں کی طرح پاک، اور بے رنگ سا زندگی کسی کی دیکھی ہے تو اپنی واقفیت و تجربہ کے دائرہ میں بلا تامل صرف مرحوم عبدالرحمٰن کا نام پیش کر سکتا ہوں۔ نوجوانی کے باوجود اس قدر صالح و پاکباز رہنا قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑ کر بھی اس قدر محتاط و بے لوث رہنا محض عطائے الٰہی و لطف خداوندی کا حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

وہ صحیح معنوں میں مسلم مومن تھے۔ اسلام کی حقیقت ان کے دل کی گہرائی میں اتری ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی۔ کہ ان کی صحبت ان کی تقریروں سے بھی زیادہ موثر ہوتی

تھی۔ اللہ پاک کا ہر وقت بھروسہ رہتا تھا۔ ذات مبارک نبوی کے ساتھ دلی شیفتگی تھی۔ جستجو و طلب، صحابہ کرام کے دین فطرت کی تھی۔ متاخرین کے زوائد اور رنگ آمیزیوں سے دلچسپی نہ تھی۔ ملکی و سیاسی آزادی کے لیے بے چین رہتے تھے اس لئے کہ ان کی بصیرت کو قرآن کریم سے اس کے احکام ملتے تھے۔ دینی خدمت کی ہر صنف اور ہر صورت کے لئے ان کی زندگی وقف تھی تقریر و تحریر کے علاوہ اگر کوئی موقع جہاد بالسیف کا آجاتا تو اس میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا جزئیات عقائد میں ان کا داری خاص مسلک تھا بجائے کسی خاص فرقہ کی جانب زیادہ جھک جانے کے اپنا انتساب محمد رسول اللہ کے لائے اسلام ہی کی جانب پسند فرماتے تھے۔ شان رحماء بینھم کو پوری طرح نباہا عقائد و خیالات میں اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لئے بھی ہمیشہ نرم سے نرم تاویل پسند فرمائی ذاتی دشمن ہر شخص کے ہوتے ہیں میرے تجربے میں ان کی شخصیت اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ میں نے ان کا کوئی دشمن نہیں دیکھا۔

وہ صحیح معنی میں درویش تھے گو کبھی اپنی درویشی کی نمائش نہیں کی۔ صبر و ضبط فطرت ثانیہ بن گئے تھے ماسوائے اللہ بے تعلقی و بے نیازی زندگی کا جز تھی۔ بڑی سی بڑی ترغیب نے بھی کبھی پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کی۔ بار بار بڑے بڑے کٹھن وقت پڑے اس کا پتہ خاص خاص دوستوں تک کو نہ چلنے دیا۔ کلکتہ کے زمانہ قیام میں ایک مدت تک معاش کی یہ عسرت رہی کہ گویا نیم فاقہ کشی تھی۔ یہ سارا زمانہ ہنسی خوشی گزار دیا۔ لب کبھی حرف شکایت سے آشنا نہ ہوئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک سرکاری یونیورسٹی کی طرف سے علوم اسلامیہ کی پروفیسری کے لئے تحریک ہوئی معاہرہ جس قدر ندوہ میں پا رہے تھے اس سے بقدر چھ گنے سے زائد تھا، شہرت و ناموری وغیرہ اس پر مستزاد۔ اللہ کے اس نیک بندے نے نہ صرف اس دعوت کو مسکرا کر ٹال دیا بلکہ اپنے خاص رفیقوں اور دوستوں سے بھی اس کا ذکر

نہ کیا! قناعت، استغنا، ایثار، یہ الفاظ سننے میں بار بار آتے ہیں۔ دیکھنے میں ان کا پورا
صرف عبدالرحمٰن کی ذات میں آیا تھا۔

وہ صحیح معنی میں متقی تھے۔ زبان، آنکھ، کان اور دل سب کو بدی، بدکاری و بدخیالی
روکے ہوئے تھے۔ حلم و تحمل خمیر میں داخل تھا۔ سخت سے اشتعال کے موقع پر بھی برہم
نہیں ہوتے تھے۔ اپنے طویل سابقہ میں غصہ آئے میں نے ایک موقع پر بھی نہیں دیکھا
یوں پر شفقت، محتاجوں کی خبر گیری، بے کسوں کی امداد کے بغیر زندگی محال تھی۔ انکسار
فروتنی، ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے مقابلہ میں برتتے تھے۔ بڑوں کے ادب و لحاظ اور چھوٹوں
محبت و الفت سے کسی گھڑی خالی نہ تھے۔ نفل نمازیں پڑھتے تھے، مگر چھپ کر، روزے
کثرت رکھتے تھے، مگر راز بنا کر۔ بے لوثی اور بے نفسی، انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ خودداری
جدید مفہوم (خودی، خودبینی و خودنمائی) سے بالکل ناآشنا تھے۔ ساری زندگی اطاعت
عبادت، تقویٰ و طہارت میں گزاری مگر کبھی اپنی مذہبیت، پاکبازی و تقدس کی تجارت
قومی و اجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑنے کے باوجود بھی کبھی آگے بڑھنے کی اور
ابھرنے کی کوشش نہ کی، یہ آزمائش بھی ہر واقف کار پر روشن ہے کہ کوئی معمولی بات نہ

دل کی ان ساری فضیلتوں کے ساتھ دماغ بھی ممتاز لے کر آئے تھے۔ صحیح معنی میں
و طالب علم تھے، علمی مصروفیتوں سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی۔ علوم میں سب سے زیادہ دل
چسپی کی چیز، کسی انسان کی نہیں، اللہ کی کتاب حکیم تھی۔ خاص شغف و انہماک اسی
مطالعہ میں تھا لیکن اس کے علاوہ بھی سارے دینی و مذہبی ذخیرہ ادبیات پر گہری اور وسیع
نظر تھی۔ خدمت دین کے غرض سے انگریزی بھی بقدر ضرورت پڑھ لی تھی۔ حالات حاضرہ
سے پوری طرح باخبر رہنے کے لئے بہ کثرت اخبارات و رسائل کا مطالعہ برابر رہتا تھا۔
میں سادہ تھا۔ حسن ترتیب، حسن بیان، سلاست زبان، ذوق انشاء کی شہادت

ان کے قلم کی نکلی ہوئی ہر سطر دے رہی ہے۔

الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا کہ اس نادر شخصیت اس جامع کمالات، اس حیرت انگیز
عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھو دیا۔ بہر حال تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہی اور
بجز صبر و شکر کے اب کسی کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں۔

پچھلے سال اسی مبارک مہینہ کے آغاز میں مجھے مرض قلب کے متعلق ایک بہت سخت
دورہ پڑا تھا معلوم ہوتا تھا کہ حرکت قلب فوراً بند ہوا چاہتی ہے اس وقت میں ایک مختصر
وصیت نامہ تحریر کیا تھا اس کی دفعہ یہ بھی کہ میری تجہیز و تکفین، نماز جنازہ وغیرہ جہاں تک
ممکن ہو منجملہ اور دو تین صاحبوں کے مولوی عبدالرحمٰن کے ہاتھوں انجام پائے۔ رفیق
کی رفاقت اعلا کے اختیار کرنے پر حریص عبدالرحمٰن! جس شخص کو تمہارے خلوص، تمہاری
برگزیدگی تمہارے ایمان پر اس درجہ اعتماد تھا۔ کیا خبر تھی کہ تم اس قدر جلد اسی کے اعتماد
شکست کر دوگے اور کون کہہ سکتا تھا کہ اسی بدنصیب کو آہ! تمہاری تعزیت و ماتم میں
اشکبار ہونا پڑے گا۔

بیوہ اور مصیبت زدہ ماں کے اکلوتے فرزند عبدالرحمٰن! جس ماں نے اپنی
بیوگی اور پھر کم سنی کی بیوگی تمھیں کو دیکھ دیکھ کر پار کر دی، اور جس نے اپنی ساری خوشی
اور آرزوئیں، حوصلوں اور ارمانوں کا مرکز تمھارے ٹکڑے کو رکھا۔ آج اسی دکھیاری کے
کلیجہ کے ٹکڑے کس طرح کٹ کٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے ہیں! کیا یہ حسرت وہ اپنے
ساتھ قبر ہی میں لیجائے گی کہ ایک بار تم اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو آکر پونچھ دو! نوجوان
بی بی، ایک عصمت مآب پردہ نشین کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دینے والے عبدالرحمٰن
جس دُلاری کو تم اس کے ماں باپ سے چھڑا کر وطن سے بے وطن کر گئے اس کے بچپن کی
سہیلیوں سے جدا کر کے اس کا ڈولا بڑے شوق و ارمان سے اپنے ہاں لا کر اتارا تھا اور
جس کا لباس عروس ابھی میلا نہیں ہونے پایا تھا اور جس حسرت نصیب کو آخری دفعہ

تمھاری خدمت کا موقع بھی نہ مل سکا، آہ آج اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے! کیا اب بجز
حشر کے اب تمھارا دیدار اسے نصیب نہ ہوگا۔؟

معصوم بچی کے معصوم والد عبدالرحمن تم تو غیروں کے یتیموں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر
سمجھتے تھے آج خود تمھاری بچی معصوم تمھارے غم میں کیسا بلک رہی ہے کیا اس کے سر پر
اب وہی ہاتھ پھیرے گا جو یتیموں اور غم زدوں بے کسوں اور بے وارثوں سب کا حقیقی
والی و وارث ہے۔؟

عزیزوں سے بڑھ کر عزیز، مخلصوں سے بڑھ کر مخلص عبدالرحمن! اپنے ایک
بیکار اور شکستہ بھائی کی جانب سے سلام و رحمت مغفرت و رحمت کی بے گنتی اور دل
سے نکلی ہوئی دعاؤں کا ہدیہ حقیر قبول کر، تمھاری آنکھوں سے آج پردے اٹھ چکے ہیں۔
عبادت سے گزر کر آج تم معنی و حقیقت کے محرم اسرار ہو چکے ہو جمال سرمدی کے لئے
حجاب نظارہ سے تم آج شادکام ہوئے ہوئے تمھیں ان خوش نصیبوں کا واسطہ
بے نیاز کی حریم ناز میں شرف باریابی حاصل کر چکے ہو اس کی عظمت و کبریائی کا
صدقہ کہ لهم ما یشاؤن عند ربهم کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور راضیۃ مرضیۃ
خلعت سے سرفراز ہو کر اور لهم ما یشاؤن فیها ولدینا مزید کے انعامات سے مالامال
اپنے گنہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا اور اللہ کی یکتائی نے زبانی اقرار
کرنے والوں کے حقوق کو فراموش نہ کر جانا۔ دنیا نے تمھیں اگر نہیں پہچانا تو معذور بھی اہل
دنیا اگر تمھاری قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکی تو کچھ ہرج نہیں جس سے تم کو اور ہر ایک کو
آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے وہ تو بہرحال بے خبر نہیں۔ کل من علیها
فان ویبقی وجه ربك ذو الجلال والاکرام

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

~~~
~~~

ہمنام نامور[1]

○

سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ قوم کو ناخدائے قوم محمد علیؒ کا داغ سہنا پڑا اخبار عیسوی ختم ہو رہا ہے کہ محمد علی کے دوست و محب عبدالماجد بدایونی یک بیک اور دفعۃً اپنے سب اور ادنیٰ رفیقوں کو چھوڑ چھاڑ کر اس بیوفا دنیا سے منہ موڑ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے! سنتے چلے آئے تھے کہ آغاز اور انجام میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور اول با آخر نسبتے دارد کسے خبر تھی کہ جو سال شروع یوں ہوا تھا وہ ختم بھی یوں ہو گا۔ اور کون کہہ سکتا تھا کہ ملت کے حق میں یہ پرانی ضرب المثل اپنے اس دردناک معنی میں صادق آ کر رہے گی۔

شعبان سنہ ۱۳۴۹ھ آیا تو ماتم اس کا کرنا پڑا، جو تحریک خلافت کا بانی و علم بردار تھا شعبان سنہ ۱۳۵۰ھ کا آیا تو زخم اس کا اٹھانا پڑا جو اس وقت خلافت کمیٹی کا صدر تھا! کہنے

---

[1] سچ لکھنؤ سنہ ۱۹۳۱ء

یں کہ اس ماہ مبارک میں ایک شب مبارک ایسی آتی ہے جس میں سال بھر کے لئے افراد اقوام
کی قسمتوں کا فیصلہ صادر ہوتے ہیں۔ کیا ہم شوربختوں کی قسمت میں اب لیلۃ البرات کے معنی
صرف نالہ و فریاد بیتی و بیوگی حسرت و حرماں، غم دائم، شیون ماتم کے رہ گئے ہیں؟ نہیں شعبان
بیکسی کے اپنا مہینہ کہہ کر پکارا ہے شعبان شہری کی خلعت سے سرفراز کیا ہے اسے سال
کے سب مہینوں سے محبوب تر قرار دیا ہے دکان احب الشہور الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
شعبان۔ ابوداؤد) حق ہے کہ اس آقا کے سرفروش غلام اس مہینے کو اپنے لئے اختیار کریں
اور اس شمع کے پروانے اپنی اپنی جان کے نذرانے اسی محبوب زمانہ میں لے کر آگے بڑھیں!

——————————*
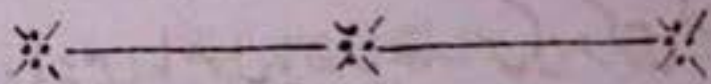
مرحوم بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے۔ ناز و نعمت میں پرورش
پائے ہوئے ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک دو مردوں کو کھلا
کر کھانے والے۔ تحریک خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیار زندگی بدل دیا۔ اور معاشرت
بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر دی جیل نہیں گئے لیکن جیل پہونچنے کی کوشش میں کوئی کسر بھی
نہیں اٹھا رکھی اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعۃً ترک کر کے درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا
مجاہدہ بھی جیل جانے کے مجاہدے سے کم نہ تھا۔ خلافت جمعیۃ علماء، تبلیغ تنظیم، مسلم کانفرنس
اور آخر میں پھر خلافت جس تحریک میں شریک ہوئے دل و جان شغف انہماک مستعدی سرگرمی سے شریک ہوئے جس کام میں
لگ گئے اس میں جان ڈال دی۔ زندگی کے آخری ۱۰۔۱۲ سال کا ہر گھنٹہ بلکہ کہنا چاہئے ہر منٹ قومیات کے لئے
وقف تھا۔ سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا۔ مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے
باوجود، کام کے پیچھے دیوانے تھے۔ اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ تیز بخار چڑھا
ہوا ہے اور مجاز کی کانفرنس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے اور امین آباد
کی محفل میلاد ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹہ تک بیان کر رہے ہیں۔ شانے میں ورم، ہاتھ
سینے میں پڑا ہوا لیکن یہ کیسے ممکن کہ مجلس تنظیم کی مجلس عاملہ میں شرکت نہ ہو۔ ہ والدہ ماجدہ

نزع میں اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں۔ بہو کی آخری سانسوں کی اطلاع آرہی ہے
اور آپ ہیں کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رلا رہے ہیں۔ کل لکھنؤ م
تھے آج کلکتہ پہونچ گئے۔ عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا نماز آکر میرٹھ میں پڑھی۔ صبح پٹنہ میں
شام کو معلوم ہوا کہ دکن کے راستہ میں ہیں! عجیب وغریب مستعدی بھی عجیب ترہمت مرد

تحریک خلافت کے، کم از کم اپنے صوبے میں تو شاید سب سے بڑے پرجوش مبلغ
علمبردار رہے مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے جمعیۃ العلماء کے اجلاس اجمیر دا
مارچ ۲۲ء میں جو ہنگامہ خیز تقریر کی تھی اس کی گونج گویا اب تک کانوں میں سمائی ہو
کانگریس نے بھی ایک زمانہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اس کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تو بہر حال تھے
غالباً اس کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ اور تحریک تنظیم ۲۳ء و ۲۵ء والی تو جب
زندہ رہی بڑی حد تک انھیں کے دم سے جیتی رہی۔ مسیح الملک اجمل خاں مرحوم اور رئیس ا
محمد علی دونوں ہی سے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے شاید انھیں سے ملنے کی
تھی جو وہ مضطرب روح سب کو چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئی۔

٭ ٭ ٭

لکھتے اچھا تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن جیسا
تھے اس سے کہیں بہتر، بدرجہا بہتر، چند در چند بہتر بولتے تھے۔ تقریر اور موثر تقریر
پر کر سکتے تھے اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو
دیتے تھے لیکن اصل ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی۔ حبیب رب العا
کا ذکر پاک کرنے اٹھتے تو اپنے آپ میں نہ رہتے بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل
طرح جھومتے اور لچکتے، خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی اور خوش بیانی مست ہو
منھ چومتی۔ ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ا
ایک جملہ نظر آتا تھا کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا نکلتا چلا آرہا ہے! فصاحت و بلاغت

تھا کہ آبلا پڑتا ہے۔ کیا ربیع الاوّل میں جنّت کی حوروں اور آسمان کے فرشتوں کو بھی
کا شوق ہوا ہے کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں اس کی نعت ایک خاکی کی
سے بھی سنیں ؟

ایک زبردست و خوش عقیدہ صوفی تھے قادریت تو حد توغل تک پہونچی ہوئی، بزرگ
ب خاص، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے۔ لیکن حضرت
الہندؒ کے پوری طرح معتقد، بڑے ذہین بڑے ذکی شوخ و طباع، بڑوں کی عظمت کرنے
ے چھوٹوں پر شفقت کرنے والے، متواضع و خوش اخلاق، فیاض و مہمان نواز، خود مصنوں
صف یہ تھا کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے، دل سے ملتے تکبر سے دور، تمکنت سے نفور، پہلی
قات میں بے تکلف ہو جاتے اور اپنے اعزاز و وقار کی ذرا پروا نہ کرتے۔ جس کے دوست
ے آخر تک ساتھ دیا حق نباہ دیا۔ وضعدار ایسے کہ دوستوں اور دوستی کے ادب پر
بان کر دیا۔ لڑتے تو معاف کرنے پر تیار ہو جاتے، روٹھتے تو بخشنے میں دیر نہ کرتے۔ دوستوں
خفا ذرا جلد ہو جاتے خوش جلد تر ہو جاتے۔ ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے اور خدمت
چھوٹے بڑے کی کمر بستہ رہتے۔ لکھنؤ میں ایک مرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی خود دوڑ
کر مہمانوں تک کھانا پہونچاتے اور مستعد ہو کر مریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے۔

مرنے والے، اپنے مالک و مولا کے حضور میں جا اور اپنے ادنیٰ و گمنام ہمنام کا آخری
م لیتا جا، تو نے اپنے وطن سے دور مسافرت میں موت پائی، اور تیرے سچے سردار نے
دت کو شہادت کی موت فرمایا ہے۔ تیرے نامور آقا نے اپنا سفر آخرت دوشنبہ
ح کو اختیار کیا تھا تیرا رخت سفر بھی اس سے کچھ ہی قبل شب دوشنبہ میں بندھا۔
خوش نصیبی میں کسے شبہہ ؟ لیکن یہ تو تھا کہ تو دوسروں کے بچوں پر رحیم و شفیق تھا
خود تیرے کمسن بچوں اور بھتیجوں کے سر پر ہاتھ کون پھیرے گا ؟ تیرا درد مند دل
ی اعانت کے لئے تڑپ جاتا تھا، آج خود تیری لٹی اور اجڑی ہوئی بیوہ کی غمگساری

کون کریگا؟ تو ہر مسلمان کے حق میں قوت بازو تھا آج خود تیرے بھائی کے مجروح دل پر کون مرہم رکھے گا؟ تو قوم کے دھندوں سے کسی وقت خالی نہ تھا اب اس بیڑے کی ناخدائی کون کریگا؟ ـــــ ہاں وہی کریگا جو تیری طرح فانی نہیں، باقی ہے، عہد نہیں رب ہے، بے بس نہیں قادر ہے، جو ہر یتیم کے حق میں باپ سے کہیں بڑھ کر شفیق، ہر بیوہ کے لئے شوہر سے کہیں بڑھ کر غم گسار، ہر مسلمان کے لئے بھائی سے کہیں بڑھ کر سامان تقویت اور قوم کے حق میں سردار قوم سے کہیں بڑھ کر ناصر و حافظ ہے ....

.... جو ان کا سہارا ہے جن کا کوئی سہارا نہیں اور جو جس خاک کے پتلے سے جب تک جو کام چاہتا ہے لیتا رہتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنے حضور میں واپس بلا لیتا ہے۔ بقا ہے تو اسی کی ذات کو اور دوام ہے تو بس اُسی کے نام کو!

سید الطائفہ

مولانا سید سلیمان ندوی

(۱۸۸۵ء - ۱۹۵۳ء)

نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا شبلی کا مختصر علالت کے بعد ان کے وطن اعظم گڑھ میں انتقال ہوگیا تو ہم لوگوں کا مختصر سا قافلہ بے سالار رہ گیا۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ سن و سال علم و فضل میں زہد و تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور اس پر مولانا کے عزیز قریب بھی۔ لیکن اول تو ان کا قیام حیدرآباد میں کشتی در جیحوں ملاح در فرنگ کا مصداق اور پھر اسی چھوٹی سی ٹولی میں سب دینہار و متقشف ہی نہ تھے بعض بددین بلکہ بعض مجھ جیسے بے دین بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ مولانا فراہیؒ کے نباہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ رہے مولانا ابوالکلام تو ایک تو وہ بھی صدہا میل کے فاصلہ پر کلکتہ میں اور پھر اسی وقت سونی صدی سیاسیات میں پھنسے ہوئے۔ ان دونوں ہستیوں کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد قرعہ انتخاب سب کا بالاتفاق شبلی کے فاضل ترین و قابل ترین شاگرد سید سلیمان ندوی بہاری کے نام پر پڑا اور جانشینی کا تاج سب نے ہاتھوں ہاتھ انھیں کے سر پر رکھا۔

مکینوں کے سر پہ یارب پیر میخانہ رہے

سلیمان "پیر" ہوں یا نہ ہوں بہر حال "پیر میخانہ" کی صلاحیت سب سے زیادہ رکھتے تھے۔ پٹنہ میں سرکاری کالج میں لکچرر تھے آئندہ ترقیوں اور بیش قرار مشاہرہ کے حقدار تھے سب چھوڑ چھاڑ کر آگئے اور استاد کے آستانہ پر جم کر بیٹھ گئے۔

صدق جدید ۴ر دسمبر ۱۹۵۳ء

نومبر ۱۹۱۴ء کا زمانہ ہے اور اعظم گڑھ کا مقام شہر کی آبادی سے الگ ایک نہایت وسیع احاطہ کے اندر ایک بچوس کے بنگلہ میں، ۵۷ سال کی عمر کا ایک مریض اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا اور زندگی سے مایوس شدید کرب کی حالت میں تڑپ رہا ہے اور پہلو میں بیٹھے ہوئے اپنے عزیز شاگرد و تیماردار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ادھ کٹے لفظوں میں کچھ وصیت کر رہا ہے۔ وصیت اپنے مال و جائداد خاندان و اعزہ سے متعلق نہیں دنیا سے رخصت ہوتے دُھن کچھ اور ہی سر پر سوار ہے ذرا کان لگا کر سنیے۔

"سلیمان ...... سیرت ..... سب کام چھوڑ کر سیرت"

یہ وصیت کرنے والا تھا مشہور فاضل اُور اردو کا نامور ادیب و اہل قلم شبلی نعمانی جس کو آخر میں کئی سال سے لگن تھی تو ایک اعلیٰ سیرۃ نبوی کی اور وصیت سننے والا تھا اسی اُستاد کا ہونہار ترین شاگرد سید سلیمان، سلیمان اس وقت جوان تھے کوئی ۲۹، ۳۰ سال کی عمر کے اور کس جوان کے دل میں دنیوی ترقیوں کے ارمان اور مالی خوشحالی کے حوصلے نہیں ہوتے؟ مرنے والے کی وصیت کو سنا ظاہری کانوں سے نہیں گوش دل سے سنا اور تعمیل اسی طرح کی کہ شاید استاد مرحوم خود بھی اسی طرح تعمیل نہ کر پاتے، رفیقوں جلیسوں نے سید الطائفہ کہہ کر پکارا اور خانقاہ شبلی کے اس جنید پر لقب بدر کی طرح چھا کر رہ گیا۔

سیرۃ النبی (جلد اول تا ششم) کے اس ضخیم و عظیم الشان کارنامہ کی مثال اردو کیا کسی اور زبان میں تو کیا ہوتی عربی میں بھی ملنا مشکل ہی ہے۔ مولانا شبلی بیچارہ تو صرف اس کے ابتدائی حصے لکھ سکے تھے اور نظر ثانی ابھی اس کی باقی تھی۔ سیرۃ کلیۃً کارنامہ کہنا چاہیے کہ سلیمانی ہی کارنامہ ہے اور شبلی کا نام بہ طور تبرک ہی کے شامل ہے سلیمان کا یہی کارنامہ انھیں سلیمان اعظم بنا دینے کے لیے کافی ہے زندگی بھر وہ کچھ اور نہ کرتے اور یہی اپنی یادگار چھوڑ جاتے جب بھی ان کا نام تا رہتی دُنیا تک روشن رہتا۔

. رسول کریم کے ممتاز سیرۃ نگاروں کی صف اول میں انھیں جگہ ملتی اور حشر میں اپنے جد اعلیٰ کے نگاہ کرم و شفقت کے روبرو شبلی اور قسطلانی اور زرقانی کے زمرہ میں وہ بھی محشور ہوتے لیکن سیرۃ النبی کے جلو میں تو ایک پورا لشکر ہی ہے۔ رحمت عالم اور ارض القرآن، سیرت عائشہ اور خطبات مدارس نقوش سلیمانی اور خیام عرب و ہند کے تعلقات حیات شبلی، لغات جدیدہ اور عربوں کا فن جہاز رانی۔ چھوٹی بڑی نئی پرانی، دینی علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے بھی تو کیسے بھلا سکتا ہے ؟

انچاس سالہ تصنیفی زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے ؟

شبلی منزل کا لب مرگ لیکن دیکھ رہا تھا کہ بات بگڑی جا رہی ہے۔ کام کے ساتھ ساتھ کام کی حسرتوں کا ایک انبار اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہے۔ سعادت مند شاگرد نے گرتا ہوا علم تھام لیا۔ جو بات بگڑ چلی تھی دم کے دم میں بنا لی۔ کام کرنے والوں کے ایک نظام دار المصنفین کا تو خاکہ ہی خاکہ استاد مرحوم کے ذہن میں تھا حوصلہ ہی حوصلہ تھا اور کاغذ پر ابھی نقشہ ہی تیار ہو پایا تھا عمارت ساری کی ساری تو سلیمان ندوی ہی نے تیار کر دی اور اپنے ندوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ ۱۹۱۵ء ہی سے دار المصنفین کا باقاعدہ ادارہ قائم کر دیا اور الندوہ کا جانشین نعم البدل معارف کے نام سے جاری کر دیا ادارہ اور رسالہ نے ۳۵، ۳۶ سال کے عرصہ میں جو کچھ کر دکھایا اس کا تعلق ماضی سے نہیں حال سے ہے خبر سے متاہدے سے ہے شنید سے نہیں دید سے ہے ۔۔ اسلامی ادبیات کے اتنے ذخیرہ عظیم کی سعادت اسی خوش نصیب کے لیے مقرر ہو چکی تھی۔

۱۹۲۰ء سے جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے بعد علمبرداران امن کی پوری یورش

خلافت پر شروع ہوئی ہے ترکی کا "مرد بیمار" خلیفۃ المسلمین ہر طرف کے نرغہ میں ہے
اور شاطران سیاست کی کوشش ہے کہ جنگ میں شکست کے بعد خلیفہ کے پاس بچا کھچا جو
کچھ رہ گیا اسے بھی شرائط صلح کے بہانہ سے ہتھیا لیا جائے۔ محمد علی کا قلب مومن ہر موقع
کی طرح اس وقت بھی تڑپ اٹھا اور خلافت کمیٹی نے جو ایک آدھ سال قبل قائم ہو چکی
تھی ان کی صدارت میں ایک وفد یورپ بھیجنا طے کیا لیکن مسلمان کا اصل مطالبہ مذہبی
تھا نہ کہ سیاسی سوال یہ اٹھا کہ اسلامی ہند کی دینی اور مذہبی نمائندگی وفد میں کون کرے
ہندستان کے علماء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی تحریک میں سب سے پیش پیش تھے
لیکن وہ اس سفر سے معذور سب کی نگاہ بالاتفاق سلیمان ندوی ہی پر پڑی اور وہی اس
وفد میں دینی رکن کی حیثیت سے شریک ہو کر یورپ روانہ ہوئے۔ اور وہاں نہ صرف
مناسب موقعوں پہ تقریریں کیں بلکہ انگریزی پریس میں جو زہر افشانی ترکوں کے
خلاف ہوتی رہی اس کے جوابات بھی تاریخی اور فقہی حوالوں سے مدلل و مستند انگریزی کا
ترجمہ کرا کے دیتے رہے۔ اکبر الہ آبادی کے یہ شعر اسی زمانے کے ہیں ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی ۔۔۔ وہ ندوی ہے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے ۔۔۔ مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت نہیں ہیں ۔۔۔ خدا غیر سے ان کو کردے غنی

اور وفد جب لندن سے پیرس پہنچا تو اسی وقت اسی پیر ظریف نے فرمایا ؎

دعائیں کر رہے ہیں ہم یہاں مسجد کی دریوں پہ
مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پہ

جانشین شبلیؒ گوشہ نشین اور محض کتاب نویسی نہ تھا۔ سیاسیات کا بھی مرد
میدان تھا خلافت کی مجلس انتظامیہ و مجلس عاملہ میں مدتوں شریک رہے۔

اپریل ۱۹۲۶ء سے حجاز سے شریفی خاندان کی حکومت ختم ہوئے عرصہ ہوچکا ہے
اور اب تسلط سلطان عبدالعزیز ابن سعود کا ہے۔ ہندوستان کی خلافت کمیٹی سے ان
کے بڑے بڑے وعدے تھے لیکن اب ان کے ایفاء کا امکان دور ہی ہوتا جارہا
تھا اس نے ایک خاص جوش و ہیجان سارے ملک میں پیدا کردیا تھا۔ بہرحال وہاں
ایک عالم اسلامی کی موتمر یا کانفرنس منعقد ہورہی تھی اور اس میں شرکت کی دعوت
خلافت کمیٹی کو بھی موصول ہوچکی تھی۔ وفد میں انتخاب علی برادران اور شعیب قریشی کا ہوا
اور اب گفتگو یہ تھی کہ رئیس وفد کون ہو؟ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اٹھ کر نام سید صاحب
کا پیش کردیا اور سماً ساری گفتگو ختم تھی ان سے بہتر رئیس وفد حجاز اور ہو کون سکتا
تھا عربی میں آزادی اور پوری قدرت کے ساتھ کیا گفتگو اور کیا تقریر اور پھر
دینی مسائل پر ان سے بہتر اور کون کرسکتا تھا؟ — پھر یہ سفر بھی ان کے لیے نیا نہ
تھا۔ وہ ایک سال قبل جب شریفی، سعودی تصادم شباب پر تھا جب بھی تو وہ وفد
خلافت ہی کے رکن کی حیثیت سے جاچکے تھے۔

آخر آخر میں تصوف بہت غالب آگیا تھا۔ حکیم الامت و امام طریقت تھانویؒ
کا آخری زمانہ تھا کہ ان سے عقیدت پیدا ہوئی اور والہانہ حد تک پہنچ گئی۔ بیعت
ہوئے اور مرشد انور میں ایسا جذب ہوئے کہ ایک لفظ فنا فی الشیخ جو مدت سے سننے
میں آرہا تھا۔۔ اس کا عملی نمونہ پیش کردیا۔ تصنیفی، تحریری، تقریری یہ سارے ذوق
کم ہوتے گئے اور اسی نسبت سے وقت اوراد و اذکار کی نذر ہونے لگا۔ نیند
طبعی طور پر زائد تھی لیکن ہم بے تکلف قدیم نیاز مندوں کو دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اسی سن
کو پہنچ کر اس پر پوری طرح قابو پالیا اور شب بیداری کوئی بات ہی نہ رہ گئی۔ خدا ترسی
نرم مزاجی تواضع، فروتنی پہلے ہی سے تھی اور مروت کے تو گویا پتلے ہی تھے۔ تصوف

کے اثر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا آخر عمر میں صدمات بھی کچھ ایسے برابر پہنچتے رہے جن کا مقصود شکوہ بینی انانیت شکنی اور نفس میں شکستگی، تضرع وابتہال کی کیفیت پیدا کر دینا تھا اور اس پر حیرت ذرا بھی نہ کیجیے کہ رسول کا یہ سیرت نگار اور دین کا دیرینہ خادم جب ۶۸ سال کی عمر میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اپنے وطن حقیقی کو روانہ ہوا ہے تو نماز مغرب پڑھے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور عالم ناسوت میں جو بالکل آخری عمل، قصد و اختیار سے ہوش و حواس میں صادر ہوا ہے وہ عمل نماز ہی تھا۔

مُفتی صاحبؒ

●

دہلی کی خبر ہے کہ عین جس وقت سال عیسوی رخصت ہو رہا تھا ۱۳ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب میں (شب پنجشنبہ) کو مُفتی صاحب نے رحلت فرمائی۔ انا للہ کون مُفتی صاحب؟ مُفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمیعۃ العلماء ۔۔۔۔۔ آج سے ۲۵، ۳۰ سال قبل جب خلافت کمیٹی کا دور عروج تھا۔ مطلق مُفتی صاحب سے مراد یہی مُفتی شریعت ہوتے تھے۔ نام لینے کی حاجت بھی نہ تھی۔ اور اس کے بعد بھی مدتوں یہی حال رہا۔

علالت اور نازک حالت کی خبریں ہفتوں سے آ رہی تھیں اس لئے دل اس آخری خبر سننے کے لئے بھی تیار تھا لیکن اس تیاری سے بھی واقعہ کی اہمیت اور صدمہ کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہو جاتی۔ فقیہ آج ہر وہ شخص سمجھا جاتا ہے جسے عالمگیری، شامی وغیرہ کے جزئیات حفظ ہوں، مُفتی صاحب مرحوم اس عامیانہ مفہوم میں نہیں بلکہ واقعۃً فقیہ تھے یعنی شریعت کے

منقول از صدق ۹ جنوری ۱۹۵۳ء

بڑے چھوٹے ہر مسئلہ میں تعمق سے کام لینے والے علماء اور ان کی ذہانت ایسی تھی جیسے امام ابو حنیفہؒ
کے ایک شاگرد رشید کی ہونا چاہیے۔ باریک مسائل کی تہ تک وہ بات کی بات میں پہنچ جاتے
خلافت کمیٹی مرکزی کے جلسوں میں بارہا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا کہ کسی مسئلہ میں شدید اختلاف
ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بُری طرح اُلجھے ہوتے ہیں کہ مفتی صاحب
نے ادھر توجہ فرمائی اور چند منٹ کے اندر ایسا آسان حل نکال دیا کہ جس پر فریقین بہ خوشی
متحد ہو گئے اور اُن کے رسالہ تعلیم الاسلام کے نام سے گو بظاہر صرف مبتدیوں کے لئے ہیں لیکن در حقیقت
منتہیوں سب کے کام کے ہیں ——— ایک بڑی بات یہ بھی کہ باوجود پختہ نیشلسٹ اور
قوم پرور ہونے کے وہ اپنی اسلامیت اور اپنے عقائد میں بھی متشدد و آخر تک رہے یہ نہ
ہونے پایا کہ سیاست کی رَو میں بہ کر اپنے مقتضیات و مطالبات ایمانی میں کسی قسم کا
ڈھیلا پن آجانے دیا ہو اور یہ وصف ایسا ہے کہ جو ان کے معاصرین میں کمتر ہی کسی میں
پایا جاتا ہے، جوش اور ہوش، غیرت ایمانی اور فہم و فراست و تدبر کا اتنا خوشگوار امتزاج
بہت نادر ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہے، تواضع و انکسار، خوش خلقی، مہمان نوازی وغیرہ کے
اوصاف حسنہ اس پر مستزاد حالات سے بددل ہو کر ایک عرصہ سے گوشہ نشین ہو گئے
تھے۔ عمر ۷۵ اور ۸۰ کے درمیان تھی یہ حیثیت مجموعی اپنے کمالات کے لحاظ سے اپنی نظیر
بس آپ تھے۔ اللہ لحد سے بلند مراتب سے سرفراز فرمائے۔

———

محقق گیلانیؒ

○

جو کل تک ہر غمزدہ کے لئے مجسم تسکین و تشفی تھا آج خود اس کے غم میں کون اور کس کس کو تسلی دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی و زندگی، ہمہ جودت و ذہانت تھا، کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیر زمین پہونچ چکا ہے؟

فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی (آہ کہ ان کے نام کے ساتھ بجائے مدظلہ العالی کے آج کس طرح مرحوم یا نور اللہ مرقدہٗ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھا جائے۔ گو یا زبان و قلم کچھ روز بعد اسی کے عادی ہو جائیں گے) دور حاضر کے طبقۂ علماء کے خواص میں نہیں — اخص الخواص میں تھے، بلکہ کہنا چاہئے تھا کہ اپنی دقتِ نظر و نکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ دینیات و شیخ الحدیث سالہا سال رہے اور نظر جیسی حدیث پر تھی ویسی ہی قرآن مجید، فقہ، اصول فقہ، کلام تصوف اور معقولات پر بھی تھی۔ عقائد اہل سنت میں پختگی دیوبندی تعلیم و تربیت کی کھلی ہوئی برکت تھی، پھر جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت استاد کے برسوں جوانگریزی خواں طلبہ اور اعلاڈگریاں رکھنے والے استادوں سے یکجائی رہی اس نے علوم جدیدہ اور مسائل حاضرہ سے بھی انھیں پوری طرح باخبر کر دیا تھا۔ اور خیالات میں وسعت اور رواداری اسکا قدرتی نتیجہ تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی

(ف ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء — ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء) صدق جدید ستمبر ۱۹۵۶

ہیر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

مولٰنا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، معقولی اور صوفی صافی تھے۔ تاریخی مطالعہ
وسعت و کثرت نے انھیں مورخ بھی بنا دیا تھا طلبہ اور اونچے یونی ورسٹی طلبہ کے حق میں بہترین
م تھے اور ایک بہترین مقرر و خوش بیان خطیب بھی تھے۔ انبالہ کے ایک اجلاس ندوہ ۱۹۳۶ء
میں یک دفعہ دیکھا کہ گو بولنے والے اور بھی اچھے اچھے علماء موجود تھے لیکن پبلک کی طرف سے
بار مطالبہ جس بزرگ کی تقریر کے لئے ہوتا وہ بعد مولٰنا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بدیہی مولٰنا
نی تھے — قوتِ تحریر کا جو ملکہ مولٰنا کو حاصل تھا۔ اس سے ناظرین صدق ناآشنا نہیں۔
خاص طرزِ انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں خود اس کے موجد تھے۔ تحریر
سب سے بڑا وصف بے ساختگی و برجستگی تھی جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی
گئے۔ جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگاتے
تے جاتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔

مسلک میں دیوبندی ہونے کے باوجود بڑے بڑے ندویوں سے بڑھ کر روشن خیال تھے۔ اور
ت "جدیدیت" سے بیزار و متنفر نہیں بلکہ اس کے منشا سے واقف تھے اور ہر تازہ فتنہ کی گہری
ں پر پوری نظر رکھنے والے تھے۔ حمایت و نصرتِ اسلام میں ہزار ہا ہزار صفحہ لکھ ڈالے
ی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، النبی الخاتم، تدوین قرآن، تدوین حدیث،
ین فقہ، ظہور نور، ابوذر غفاری، سوانح قاسمی وغیرہا کے علاوہ محض مضامین و مقالات ہی
ضخامت ہزار ہا صفحات تک پہونچے گی۔ کاش مولٰنا کے کوئی سعید شاگرد وقت نکال کر
متفرق و منتشر اجزا کو یکجا و مرتب کرنے کی زحمت گوارا فرماتے! — شاگرد دل
کر گیا تو یہ بھی کشش رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا اپنے ایک نہیں متعدد
ر دل میں دینی و علمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں اور ان لوگوں نے
م دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں ان کے اجر کے بھی بڑے حقدار خود مولٰنا ہی ہیں۔

بعض کتابوں کے ناتمام رہ جانے کا افسوس خصوصیت کے ساتھ ہے مثلاً تدوین حدیث جو تاریخ حدیث پر تھی۔ وہ اگر مکمل ہو جاتی تو منکرین حدیث کے شبہات کا بہترین مدلل و شافی جواب بھی تھی متعدد اور عنوانات بھی مولانا کے ذہن میں تھے سب کے سب اہم اور ضروری۔

حضرت آخر وقت تک طالب علم ہی رہے۔ آخری خطوط جو وفات سے چند ہی روز قبل موصول ہوئے علمی سوالات، علمی مسائل اور بعض اشکالات کے علمی جوابات سے بھرے ہوئے ہیں۔

مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شائبہ ایک وسوسہ بھی کہیں نہیں پیدا ہوا۔ اپنے سے چھوٹوں اور کہیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں بلکہ بعض وقت تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بیچارے خود اپنے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ـــــ بے تکلف و بے ساختہ طرز انشاء اور بے تصنع و پر جوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت و طبیعت کے پرتو تھے تحریر و تقریر دونوں میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا اُبلا پڑ رہا ہے۔!

طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو کچھ مل گیا بس اسی کو نعمت سمجھے۔ پہننے کو جو کچھ ملا خوش ہو کر پہن لیا۔ رہنے سہنے کا جو ادنیٰ سا ادنیٰ معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہو گیا اسی میں مگن زندگی گزار دی۔ ایک زمانہ میں موٹر بھی رکھا لیکن اُن کے لئے موٹر اور اکا اور جھٹکا اور پیدل سب برابر ہی تھے ـــــ بڑے رقیق القلب بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے۔ دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے۔ کسی ادنیٰ شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

دوسروں کی امداد کا حوالہ دینے میں ذرا بھی بخل اور تنگ نظر نہ تھے۔ ہر ادنیٰ امداد کا حوالہ بھی بڑی فیاضی اور خوش دلی سے دیتے اور اس کی تو میں شہادت آج اس دنیا میں بھی دیتا ہوں اور کل انشاء اللہ حشر میں بھی دوں گا کہ اپنی ۳۶۔ ۳۷ سال کے تعلق و ارتباط کی طبی مدت

ں ایک بار بھی اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔ یہ صفات اوصاف
مولی نہیں غیر معمولی ہیں۔

تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے عقیدت
صوصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات
شائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے اور وہم پرستوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں
تھے۔ اکبر کی زبان میں ؎

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن
ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

ابطۂ بیعت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے بھی۔ اور طبیعت پر مذاق توحید
بہت غالب تھا۔ نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں
سے سنتے رہیے۔

میرے ہم سن تھے اور حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علیؒ کی وفات کے بعد اب ملت کی زندہ
ستیوں میں انھیں کی ذات میرے لئے محبوب ترین تھی ہم سن کی وفات میرے لئے بھی قریب
ت کی ایک اور گھنٹی بجا دی ہے اور محبوب کے سفر آخرت نے میرے لئے بھی اس منزل
صود میں ایک اور کشش و دلکشی پیدا کر دی ہے۔!

صحت ادھر عرصہ سے بہت گر گئی تھی پھر بھی اتنی جلدی وقت موعود آجانے کا ہم
ں غفلت کو خیال بھی نہ تھا۔ شوق لقاء رب پوری طرح رکھتے تھے جیسا کہ ایک درویش عارف
رکھنا چاہئے تھا اور جہاں تک دماغی قوت کے بس میں ہے خدا جانے کتنے اسرار غیب حل
کر چکے تھے اصل حقائق کا انکشاف اب ہوا۔ اور اس وقت انشاء اللہ پوری طرح
کی لذتوں اور سرمدی راحتوں کی آغوش میں ہوں گے۔ ابھی چند ہی سال کی بات ہے
ب گیلانی مولانا سے ملنے جانا ہوا تھا اور ایک بار دفعۃً زور سا چکر سا آگیا تھا۔ اضطرارًا

میں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دل نے آناً فاناً خوشی اس کی محسوس کی تھی کہ اب نماز جنازہ مولانا ہی پڑھائیں گے مشیت کو یہ منظور نہ ہوا اور اب تو اس کی لگی ہوئی ہے کہ جس وقت اپ وقت موعود آئے گا (جو یقیناً اب دور نہیں) تو اپنے مالک مولا سے اپنے ایک قدیم بتاہ کار رفیق و نیاز مند کی شفاعت میں اصرار و مبالغہ کرنے والوں میں ایک نمایاں وممتاز شخصیت مولانا کی ہوگی۔ رخصت اے امام المسلمین، عارضی طور پر رخصت، انتم اللہ لنا ولکم العافیۃ و انشاء اللہ بکم لاحقون۔

⁂ ——— ⁂ ——— ⁂

مضمون ختم ہو چکا تھا کہ مرحوم کے چھوٹے بھائی کا خط موصول ہوا کہ آج صبح بعد نماز بھائی صاحب بستر پر لیٹے ہی تھے اور میں بھی بغل کے پلنگ پر تھا کہ اچانک روح پرواز کر گئی ...... رات اس قدر خوش اور بشاش تھے کہ میں نے زندگی بھر اتنا خوش نہیں دیکھا تھا خوب خوب گایا اور گویا رقص کیا جب ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ بعد نماز فجر یہ حادثہ پیش آگیا جو دوسروں کو جنت و رحمت کی بشارتیں سناتا رہتا اور بقول شخصے مغفرت کے پروانے تقسیم کرتا رہتا تھا، دنیا نے دیکھ لیا کہ خود اس کا انجام کتنا طرب آمیز ہوا! ناسوت کی آخری رات اس کے لئے "شب برات" بھی وعدہ وصال کے قرب نے اسے رات کو بیخود رکھا اور نماز فجر کے بعد بلاوا آیا تو پاس ہی لیٹے ہوئے بھائی کو "سکرات" کا پتہ چلنے نہ پایا! والناشطات نشطاً کے وعدہ کا تحقق اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا!

~~~~

O
~~~~

مولانا صدر یار جنگ
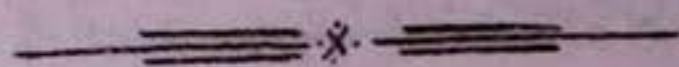
نام نامی پر نظر سب سے پہلے اُس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالب علمی کا
تھا اور مولنا شیروانی ایک نامور پختہ کار اہل قلم اپنی جوانی کی آخری منزلوں میں تھے اور علیگڈھ
تھلی کے مضمون نگار رہتے تھے۔ یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے چند ہی روز میں دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنؤ)
کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے۔ ایک ایڈیٹر تو مولانا
شبلی نعمانی تھے اور دوسرے ان کے حبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی۔ الندوہ
میں شیروانی صاحب نے لکھا یا تو برائے نام ہی لیکن بہ حیثیت ایڈیٹر کے نام برسوں چھپتا رہا گچھ ہم رنگی
اس باب میں مولانا حسرت (مرحوم) سے مل رہی کہ تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر، لیکن شاعری
نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ مضمون شاید
ند سال کی مدت ادارت میں ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبروں میں باقی ان کے نام کا تلازم
ولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن میں خوب جم گیا! ______ دو چار سال اور گزرے
اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت میں
نے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہاں تک معاملات ندوہ کا تعلق ہے۔ خاں شیروانی اور
شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا سا تعلق ہے، ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم، علی گڑھ

منقول از صدق جدید ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء

اور اعظم گڑھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتہ توافق و اتحاد!

زیارت سب سے پہلے ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں ہوئی سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا۔
ارکان میں دو پارٹیاں تھیں (اور مسلمانوں کی کس انجمن یا ادارہ میں پارٹیاں نہیں)، ایک
کے لیڈر مولانا شبلی تھے اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا خلیل الرحمن
پوری، ہم لوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیوں میں شریک کہ اگر کسی موقع پر پبلک
مدد کی ضرورت پڑی پبلک کے نمائندہ بن کر مولانا شبلی کو کمک پہونچائی جائے گی۔ فلاں
آئے اور فلاں صاحب آئے۔ اپنے لئے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسے میں
کو مل گیا۔ تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! — یہاں تک کہ مولانا شیروانی آگئے، حسن
کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلائیں لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست
"شبلوی" ہیں، دیکھنے میں یہ آیا کہ یہ اپنا دامن حریفانہ آلودگی سے بچائے ہوئے نہ گفتگو
میں گرمی، نہ لہجہ میں درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی، سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ ابنی ایک لغویت
الغو تواب کہہ رہا ہوں اس وقت تو وجہ نازش تھی، فلسفۂ اجتماع کا مقدمہ الناظر میں
اس میں دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی میں
شاہد عینی کے شیروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر میں موجود لیکن تردید
نہ تلخی اور نہ تعریض بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ پر نمایاں نہ
قلم بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شیروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور
مذہبی ہو کر نئے نئے پہنچے۔ ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا۔ میں اپنی
کے اس دور میں الحاد و بے دینی کے لئے بجا طور پر رسوا و بدنام اور میں اسی زمانہ میں
کتاب کے سلسلہ میں خاص طور پر حیدرآباد مسلم پریس کی زد میں آیا ہوا، شیروانی
عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہیں اونچے مرتبہ پر، پہلی بار حاضری کی نوبت

ن حالات میں! ڈوب گیا تو ڈرتے ڈرتے، لیکن پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل
تھا، بے جا تھا، خوب ملے اور اس کا سایہ ہی نہیں پڑنے دیا کہ میری بدمذہبی اور بدعقیدگی
شفقتوں اور عنایتوں کی راہ میں حائل ہو رہی ہے! اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی
رحیدرآباد میں رہا۔ شیروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی
رگزاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا۔

اگست میں رخصت پر لکھنؤ آیا اور یہاں سے استعفا لکھ کر بھیجا۔ بے کاری کو ابھی آٹھ
ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی میں سر امین جنگ مرحوم (صدرالمہام پیش گاہ مبارک) کا تار
علحضرت نے یاد فرمایا ہے فوراً آجاؤ، گیا۔ اسٹیشن پر ہی حکمنامہ ملا کہ قیام سرکاری طور پر
صدر امور مذہبی کے یہاں رہیگا، جانا اور رہنا پڑا۔ ۴۔۵ روز کے قیام میں مولانا کو
یب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ انکی صحیح مذہبیت (جس میں تعصب اور تنفر کا شائبہ
ی تنگی اور خشکی سے ناآشنا تھی) اعتدال و متوازن خوش اخلاقی، مہمان نوازی، ایک
اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت
ت وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا۔ اور ایک ایک چیز دل میں اتر گئی۔

اعلحضرت کے یہاں باریابی اور میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے
یں مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے اس
ں آج تک دل پر تازہ ہے۔ اب تعلقات بڑھے اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے
ذاتی قومی ملی دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے اور ملاقاتیں کبھی لکھنؤ میں
یں کبھی علی گڑھ میں اور کبھی حیدرآباد میں بھی۔ مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف اس
یا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ میں شریک ہوتے۔
سے سفر کر کے لکھنؤ آتے اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی
یہاں ان کی خیالی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی

اس معمول میں فرق نہ آنے پایا۔ اور علی گڑھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا یونیورسٹی لی رٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے!

مسلم یونی ورسٹی میں وائس چانسلر طوعاً و کرہاً ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی کل سر سلیمان کا تخت اُتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ابھی نواب مزمل اللہ خاں کا طوطی بول رہا ہے تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے۔ ابھی نواب اسمٰعیل خاں ہاتھوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پیشوائی کے لئے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ اُن کے ساتھ اور کچھ "ان" اور "کچھ" "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ شیروانی کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں تو اپنا امتیاز اسی طرح رکھے ہوئے تھے۔ مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسر پیکار لیکن شیروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

سنہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر ملک کا سواد اعظم شیخ الہند اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور علی برادران اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے ندوہ اور علی گڑھ دونوں پر اور ندوہ غریب تو خیر اصلی اور معرکہ مورچہ علی گڑھ تھا۔ شیروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں کچھ نہ پوچھئے کہ کیا کچھ سننا پڑا۔ کیا کچھ سہنا پڑا جوش اور ہیجان کے وقت کسی کو اپنی زبان پر قابو نہ رہا ہے۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے۔ اور کل حبیب الرحمن سے حبیب الشیطان مشہور ہوئے! ــــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت سے سنتا رہا ــــ ایک زمانہ وہ تھا ۱۳۔ ۱۴ سال قبل جب ابوالکلام آزاد کا شمار حلقۂ میں تبدیلیوں کے خلاف

اور مولانا شیروانی کے ہاں اُن کا تقرب خود اُن کے لئے باعث فخر و مباہات تھا۔ اب دیکھتے دیکھتے وقت آگیا تھا کہ مولانا ابوالکلام لیڈری کے بلند بام پر تھے اور شیروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہیں قائم — ظرف اور شرافت کے امتحان کے لئے دوستی و اتحاد کا نہیں مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان اپنی تند مزاجی کے لئے بدنام ہیں اور شیروانی پٹھانوں ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھا یا کہ جنھوں نے پٹھانوں کو حلم و متانت سے یکسر معری قرار دیا ہے، انھوں نے کلیہ قائم کرنے میں جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کر دا یک سا خیال
پاتے ہی حلم بھی کبھی شروانیوں میں ہم[1]

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش میں ارادہ عرس اجمیر میں شرکت کا کر لیا۔ لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، اجمیر پہونچ کر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریاں ہوگئیں، شیروانی صاحب بھی یہاں آئے ہوئے تھے۔ ذاتی طور پر یہ آستانہ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی لیکن یہاں اس وقت ان کی آمد سرکاری حیثیت سے تھی۔ مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمہ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے تھے اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع میں دیکھا، عام لوگوں کی صف میں مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے اُن سے بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر

---

[1] اس شعر میں بجائے حلم کے عقل تھا۔

سے بہتر جگہ ان کے لئے خالی کرائی جا سکتی تھی لیکن طبیعت میں انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے باوجود اپنے لئے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہیں، غلبہ تواضع کا مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا۔ حیدرآباد، اعظم گڑھ، علی گڑھ، لکھنؤ میں خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے۔ اور بعد کو بھی ہوتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا۔ انتخابی کمیٹی میں مولانا شیروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا۔ انٹرویو کے وقت جب مہمان علماء آنے شروع ہو گئے تو صدر مجلس اور ایس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا کسی ضرورت سے باہر چلے گئے۔ ان حضرت نے کیا کیا، خود بھی کرسی صدارت چھوڑ کر اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا۔ میں شرمندگی سے گڑا جا رہا تھا۔ لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ___ اور آخر زمانہ میں جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے تو یہ بار بار دیکھنے میں آیا کہ لکھنؤ میں ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہو رہا ہے اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مسند صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہیں!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی اور پر مغز بھی علمی، ادبی، شعری، مذہبی، سیاسی، تعلیمی جو موضوع بھی چاہئے چھیڑ دیکھئے، اور گھنٹوں اس مجلس سے سیری نہ ہو گی۔ اللہ نے رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا۔ کھاتے پیتے تو خوب تھے ہی کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے۔ اور جاڑوں کے موسم میں شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ اس دعوت میں جو ایک بار شریک ہو جاتا اس کو مزہ مدتوں تک نہ بھولتا۔ تحریر میں ادیب سے بڑھ کر انشا پرداز کی شان رکھتے تھے، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ کم بس ٹھیک اتنے ہی جتنے اظہار و اداے مطلب کے لئے ضروری ہوتے گویا ہوشیار اور فن کار عمارت میں گڑھی ہوئی اینٹیں جنیں

چن کر اور گن گن کر نکھار رہا ہے ـــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو
دونوں میں، میدان میں خطاب عام ہو تو اور کمرے کے اندر خطاب خاص ہو، تو زبان
حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے و نکتے و نادرات کے سانچے میں ڈھلے
ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب حج و زیارت سے واپس آئے ہیں تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات
مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ اس انداز میں بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا، خود
بھی آب دیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رُلا دیتے غیرت دینی اور حرارت
ایمانی کے تو کہنا چاہئے کہ پتلے ہی تھے سنہ ۱۹۳۰ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی
حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے
فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ تو جوں توں کر کے ہو گیا، سنہ ۳۳ء میں ایک منزل ایسی
آئی کہ قانونی کارروائی کے لئے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ
کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خاں مرحوم تھے ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو
چل چکا تھا۔ ان اثرات کو باطل کرنے کے لئے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی، اور
وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ لگی ـــــ بیچارے نے پس پردہ رہ
کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا۔ اسے چند سال
گزرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا۔ آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان
وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق بڑے ذہین اور شوخ
نگار ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے
تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز
کر جاتے، علی گڑھ میگزین وغیرہ میں طالب علمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے اور ہم لوگ بھی
داد دیتے جس طرح ہر نو مشق اور ہونہار اہل قلم کو اس کی ہمت افزائی کے خیال سے
داد دی جاتی ہے اللہ کا کرنا کہ سنہ ۲۱ء میں تو سجاد مرحوم کا بھی عین شباب میں انتقال ہو گیا۔

اور اس کے کئی سال بعد بعض خوش مذاق "بے فکروں" نے ان کے مضامین اور ایک نا تمام ڈرامہ کو کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اور علی گڑھ کے شعبۂ اُردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کون سی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بد مذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا اور پہلے باادب تمام یونیورسٹی کے استادوں کی خدمت میں عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی۔ ہار کر اور مجبور ہو کر چیخنا چلانا پڑا۔ اور اب یہاں سے شرکت صدر یار جنگ مرحوم کی شروع ہوتی ہے۔ وسط ۱۹۴۳ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی جس کے صدر موصوف تھے۔ اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوا دیا۔ حضرت کی پوری رائے صدق ۸ نومبر ۴۳ء میں اس کے ڈھائی تین کالموں میں درج ہو چکی ہے۔ یہاں اس کے چند اقتباس کافی ہوں گے۔

> "علی گڑھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین میں نہ تھا، اس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندی خیال یا پاکیزگی ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی"
>
> سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد، فلسفہ اخلاق مذہب سب سے بیزار ہیں، مذہبی ادب کا ایک فقرہ میں بہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں، بے اصول زندگی کے محبوب و مقبول ہے۔ اُن کے ہاں تین محبوب ہیں، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک وصاف ہو غرق شباب تجبہ جو کسی کمرے پر داد عیش دے رہی ہو وفاداری پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف میں ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہیں اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت وعفت کی زندگی بسر کرے تو وہ

خارج از بحث ننگ انسانیت ہے۔

دوسرا محبوب معصیت لطیف ہے مگر باوجود پوری کاوش کے ہم کو پتہ نہ لگا کہ ان معصیت دو لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار نے یہاں کیا ہے، پڑھنے والا کسی گناہ سے لطف لینا چاہے اس کو محبوب قرار دے لے

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے۔ اول سے آخر تک شیطنیت کو سراہا ہے، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدائش عالم کی اصل حکمت۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام ملائکہ مقربین بلکہ ان کے ڈرامہ "روز جزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت ہے۔ حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی بھی جس طرح اس ڈرامہ میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے، اسکو پڑھ کر ڈرامہ نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے۔ مذہب کے استخفاف سے مشتر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے مضامین زلیخا اور روز جزا میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ میں کم فہمی جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفریں ہے...... بہر حال میری رائے میں مختصر خیال نہ ادب، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور نہ کشش اور نصب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونی ورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے۔ اس کے اوصاف خود اس کے قدردانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرمائے ہیں "شعلہ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش چہر تاریکی اور اندھیرا"۔

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظم، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونی ورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے معنی ان کی تحریریں اردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں۔ اب ایسی

جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟ —— کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ
سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھ کر دل تھام لیجیے۔

ایک بزرگ ؒ کا وصال

○

اخباری شہرت کے آدمی نہ تھے۔ لیکن مرجع خلائق ضرور تھے۔ وطن شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور تھا، لیکن فیض کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لکھنؤ، اناؤ، کان پور، بارہ بنکی، فیض آباد، جون پور، الٰہ آباد، رائے بریلی، سیتاپور اور ان شہروں کے قصبات اور دیہات کا ذکر نہیں دور دراز مقامات بھوپال، سہارن پور، جھانسی، ناگپور، جبل پور، بمبئی، پونا، ڈھاکہ، چاٹگام تک کے لوگ کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں اور حضرت خود جہاں کہیں پہنچ جاتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے خلقت معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹی پڑتی ہے۔

۸ ذی الحجہ/۱۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو عین موسم حج میں عین سرزمین مکہ پر انھیں بافیض و بے مثال بزرگ نے جنھیں دنیا میں مولوی حاجی محمد شفیع بجنوری کے نام سے یاد کرتی تھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ تاریخ اور یہ زمین اگر نہ ملتی تو حسرت ہوتی اس سرزمین کے بار بار چکر اتنے بار لگائے جا چکے تھے کہ حجاز گویا وطن ہی بن چکا تھا۔ حج و زیارت کی سعادت کم از کم ۲۵ بار تو ضرور ہی حاصل ہو چکی تھی۔ عجب نہیں کہ اس سے زائد ہی مرتبہ، عمر اکیاسی سال سے اوپر تقریباً ۸۵ سال کی تھی، لیکن ہڈی چوڑی، سینہ کشادہ، جسم ایسا بھرا کہ اصل سن سے ۱۵، ۲۰ سال سے کم ہی معلوم ہوتے تھے۔

صدق جدید لکھنؤ ۱۷ نمبر ۲۰، ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء

پُرانے دیکھنے والوں اور بوڑھے رفیقوں کا بیان ہے کہ جذب و استغراق کی کیفیتیں پیدا ہوئی
کشف تکوینی اس غضب کا تھا کہ مستقبل کے واقعات کثرت سے اور بے اختیار زبان پر آجاتے
عجب عجب قصے لوگوں کی زبان پر اس دور نوعمری کے تھے بعض تو بالکل ناقابل یقین حد تک
یرت انگیز اذکار، اشغال، ریاضتیں، مجاہدے، کرامتیں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب اسی زمانہ
علق منقول ہیں۔

صوفیہ و مشائخ کے درمیان ایک شغل "شغل اسدی" کے نام سے موسوم ہے اس میں کہا
تا ہے کہ سالک کے جسم کا ایک ایک عضو اس سے الگ ہو جاتا ہے ابھی چند سال ہوئے
ثقہ صاحب علم نے ایک واسطے سے (شاید دو واسطے ہوں) یہ روایت بیان کی کہ راوی
ں نے محض اتفاق سے ایک بار حاجی صاحب کو عین اسی حالت میں دیکھ لیا تھا۔ ضرور نہیں کہ
قسم کے روائتیں صحیح بھی ہوں تاہم کسی ذات سے متعلق ان کی کثرت اشاعت بالکل
معنی بھی تو نہیں کہی جاسکتی۔

تعلیم باطن و تربیت سلوک کے لئے مرشد بھی ایسا ہاتھ آگیا۔ جو اپنے وقت میں امام
ں تھا۔ قصبہ گنج مرادآباد (ضلع اناؤ) میں محدث مولانا فضل رحمٰن نقشبندی ایک بڑے پایہ
بزرگ تھے اتباع سنت کے یکہ بے مثال۔ بیعت انھیں سے کی محض بیعت اعتقادی
یں، بیعت عشقی بھی۔ جوہر خود ناقابل اور پھر مربی ایسا کامل زیارت کعبۃ اللہ کا شوق
جزن تھا ہی۔ ایک روز کیفیات سے لبریز جوان مرید نے مرشد سے بےتابانہ عرض کیا کہ حضرت
زت دیں اب کی قصد حج و زیارت حرم رکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا زاد راہ کا بھی سامان ہے؟
ب میں مستانہ بیخودی کے ساتھ یہ شعر زبان سے نکلا ؎

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بسے
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا باوجود اس کے کہ عارف کامل اور صاحب مقام تھے مغلوب الحال عاشق

صادق کے جذبات سے چند سکنڈ کے لئے خود بیخود ہو گئے اور بے اختیار چیخ زبان سے نکل گئی لیکن معاً سنبھلے اور ارشاد فرمایا کہ کیا واہیات ہے میں مسئلہ شرعی دریافت کر رہا ہوں اور تم جواب میں شاعری کر رہے ہو۔"

بات ہو گئی درمیانی مرحلے چھوڑیئے عین حج کے موسم میں جب خانہ کعبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور ہر حاجی و زائر قدرۃً شوق دید کا رکھتا ہے شیخی کلید بردار کی نظر پڑی کہ ایک حاجی بار بار بیتابانہ طواف تو کر رہا ہے مگر معلوم ہو رہا ہے کہ داخلی کا نہایت درجہ آرزومند ہے۔ لیکن اس کا قصد نہیں کرتا ہے۔ داخلی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بلا کسی قید کے اور بلا کسی مطالبہ و نذرانہ کے ہونا چاہیے لیکن کلید بردار خاندان نے صدیوں سے اپنا دستور یہ بنا رکھا ہے کہ بلا نذرانہ وصول کئے ہوئے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے فقہا نے اسے رشوت کے حکم میں رکھا ہے اور اسے ناجائز بتایا ہے۔ عاشق دعالم میں اب کشمکش ہو رہی ہے۔ یہ عاشق صادق صاحب علم بھی تھا۔ اور مست ہونے کے ساتھ بیدار بھی۔ کچھ دیر کے بعد عشق علم پر غالب آگیا اور یہ نوجوان نذرانہ کا روپیہ بہ کراہت دربان کی طرف پھینکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ لیکن ادھر اس کا جانا تھا کہ ادھر وہ صاحب اختلاج قلب میں مبتلا ہو گئے اور بے اختیار یہ چاہنے لگے کہ وہ مرد خدا ابھی واپس ہو تو ابھی یہ جبری نذر اس کی خدمت میں معذرت کے ساتھ واپس کر دی جائے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور جب وہ نوجوان باہر نکلنے لگا تو شیخی صاحب نے خود معتقد ہو کر وہ نذر اسے واپس کی اور معاً ان کی طبیعت بحال ہو گئی۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سوختہ قلب ہمارے ہی حاجی محمد شفیع بجنوری تھے

مولانا تھانوی جن کے کمالات روحانی و عرفانی کا آفتاب بعد میں چمکا اس وقت محض ایک نو عمر مولوی ہی تھے۔ کان پور کے مدرسہ جامع العلوم کے صدر اور شہرت صرف ایک اچھے مدرس کی حیثیت سے رکھتے تھے۔ حضرت گنج مراد آبادی کی خدمت میں اکتساب فیض کے لئے حاضر ہوئے واپسی کے وقت حضرت نے اپنے اسی عزیز مرید کو ان کے سپرد فرمایا

...بچہ تحصیلی الفاظ اس طرح کے فرمائے کہ ہمارے اس لڑکے کو پوری طرح پڑھا دینا (او کما قال) مولانا
...بھی اپنے ہر طالب علم کے حق میں سراپا شفقت و توجہ تھے، چہ جائیکہ اتنے زبردست وسیلہ سفارش
...کے بعد حاجی صاحب نے علوم شرعی ظاہری کی تحصیل و تکمیل کئی سال تک اسی مدرسہ میں رہ کر کی،
...ی استاد کامل کی رہبری و نگرانی میں اور پورے عالم بن کر نکلے تحصیل معاش کے بعد فن طب کی تعلیم
...ی حاصل کر لی غالباً اس زمانہ میں میرٹھ کے نامور طبیب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری مرحوم بھی
...جی صاحب کے ہم درس اسی مدرسہ میں تھے۔

حاجی صاحب کے قصے کشف و کرامت کے اس دور کے عام ہیں۔ ایک ثقہ راوی نے اپنا
...اہدہ مجھ سے ۱۵، ۲۰ سال ہوئے بیان کیا تھا کہ ایک رات کو مطالعہ کے وقت حاجی صاحب
...حجرہ میں آگ لگ گئی شعلے بلند ہونے لگے بلکہ کپڑوں تک میں آگ پہونچ گئی لیکن حاجی صاحب مد
...ہوش محفوظ رہے بلکہ اسی طرح مطالعہ میں مشغول! ایسے عجائب و خوارق کی توجیہ و تاویل جو بھی
...جا سکے۔ بہر حال جس طرح انھیں آنکھ بند کر کے قبول کر لینا آسان نہیں۔ اسی طرح ان کی یکسر
...یب تردید بھی ثقہ و معتبر گواہوں کے ہوتے ہوئے ذرا مشکل ہی ہے۔ اور خیر یہ عقیدہ تو سب
...لنے والوں میں اس وقت عام ہو گیا تھا کہ حاجی صاحب مستجاب الدعوات ہیں، ان کی زبان
...جو کچھ نکل جاتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے ـــــ ایک واقعہ اس سلسلہ میں بڑا اہم اور
...ہ خیز ہے جسے خود حضرت تھانویؒ کا بیان کیا ہوا:-

مدرسہ میں تعطیل تھی باہر سے ایک رفیق درس کا خط حاجی صاحب کے نام آیا پتہ پر
...بانی تعظیمی القاب "قطب وقت" وغیرہ درج تھے۔ مدرسہ کی ڈاک صدر مدرس کی حیثیت
...مولانا تھانوی کے پاس آتی تھی۔ حضرت نے حاجی صاحب کو بلا کر طنز سے ارشاد فرمایا کہ لیجیے
...، تو آپ قطب وقت ہو گئے اور وہ خط ہاتھ میں دیا۔ حاجی صاحب جھنجھلا کر بولے ایسے
...وں کا دماغ بھی نہیں خراب ہوتا تا خواہ مخواہ مجھ کو رسوا کرتے ہیں، وہ بھی چار روز گزرے
...ہ کہ اس طالب علم کے بھائی کا خط آیا کہ فلاں تاریخ فلاں وقت وہ طالب علم دفعۃً [illegible]

ہو گیا۔" خدا کے لئے دعائے صحت فرمائیں۔" اب حاجی صاحب بڑے ہی قلق اضطراب میں مبتلا ہو گئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر آنسوؤں کے ساتھ بڑے الحاح واضطرار کے عالم میں بولے کہ "حضرت آخر کیا کروں وہ فقرے میں نے کچھ دشمنی میں اور جان کر تھوڑے ہی کہے تھے بس جھنجھلاہٹ میں زبان سے نکل گئے تھے ہیں تو اس نعمت سے عاجز آگیا ہوں۔"

دشواریاں عوام ہی کو نہیں خواص واکابر کو بھی پیش آتی رہتی ہیں اور ایسے ورطے سے نکالنا کام حضرت حکیم الامت ہی جیسے دقیقہ سنج مصلحین وحکما کا ہو سکتا ہے کسی محض بزرگ کا نہیں۔ حضرت نے فرمایا اس کا علاج بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی حربہ سے کام لیجئے جو آپ کے پاس موجود ہے دعا کیجئے کہ اللہ اس نعمت عظیم کے بار کا تحمل اب مجھ ناتواں سے نہیں ہوتا۔ اسے بدل کر کسی دوسری نعمت سے سرفراز فرمایا جائے۔ دعا آپ اپنی زبان سے کیجئے جس کی مقبولیت کے یہ سب کرشمے ہیں، آمین میں بھی کہتا جاؤں گا۔" حاجی صاحب اس تشخیص اور معالجہ کو سن کر باغ باغ ہو گئے۔ عمل اسی وقت کیا اور یہ دعا بھی فی الفور قبول ہو گئی یعنی اسی وقت سے وہ خاص کیفیت سلب ہو گئی۔

مولانا گنج مرادآبادی کا سال وفات غالباً ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء اس کے بعد ہی حاجی صاحب اپنے مراتب کمال کی تکمیل مزید کے لئے ایک دوسرے شیخ وقت اور مرشد گیر بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان حاجی صاحب کے مرتبہ کا کیا کہنا، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حکیم الامت تھانوی، مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا احمد حسن کانپوری (شارح ومشہور شارح مثنوی) وغیرہم کتنے اس شمع کے پروانے تھے جو آگے چل کر خود آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔ حاجی صاحب بھی اس نظر کیمیا اثر سے مستفید ہوتے اور اب قیام حرمین کا شوق بھی دل کھول کر پورا کرتے۔ ارض پاک کی حاضری کے ساتھ ساتھ مرشد کی بزم میں بھی حضوری — اب کون بتائے کون جانے کہ یہاں کیا کیا، کیا کیا پایا۔

جب ہوشوں میں اتنا ہوشیار دیوانوں میں اتنا فرزانہ مستوں میں اتنا بیدار بکثرت ہی

کوئی گذرا ہوگا ایک طرف جوش و مستی سے لبریز دوسری طرف اتباعِ شریعت کا غایت
اہتمام اور بیت اللہ کے تو گویا عاشقِ زار تھے، نام لیتے آنسو چلنے لگتے تھے۔ وجہ معاش
بظاہر کوئی خاص اور کوئی معقول نہ تھی۔ اس پر بھی بار بار حج اور اس میں فراخدلی سے
خرچ جا ایک مستقل کرامت ہی سمجھنا چاہئے ——— خود ہی نہیں جاتے تھے دوسروں کو
بھی اپنے ساتھ لیجاتے تھے۔ بہتوں کی راستہ میں خبر گیری کرتے جاتے تھے۔ حج کا موسم آتا تو جوش
و دیوانگی دیکھنے کے قابل ہوتا۔ اور عین چلتے وقت ریل پر بیٹھتے وقت تو معلوم ہوتا تھا
کہ بس یہیں دم توڑ دیں گے، وہ جوشِ گریہ وہ مستانہ اور پرخروش موعظہ و تقریر وہ آنکھوں
سے تڑپتی ہوئی بجلیاں، جس نے اس پر اثر منظر کو دیکھا نہیں۔ اس کی سمجھ میں آنا اور یقین
کرنا بھی دشوار ہے ——— ہر دفعہ روانگی کے وقت لوگ یہی پیش گوئی کرتے تھے کہ اب
واپسی نہ ہوگی وہاں کی مٹی وہیں لئے جا رہی ہے اور آخر کار زبان خلق کی اس منادی کا
ظہور اللہ نے عملی شکل میں کر ہی دکھایا۔

نماز اور روزہ اور جملہ اصناف عبادت کے ذوق و شوق شغف و اہتمام کا کیا حال
بیان ہو۔ دیکھئے اس کا تعلق تھا: تلاوت قرآن مجید کے علاوہ دوسرے اوراد و اذکار کے۔
خدا معلوم اور کن کن وقتوں میں کر ڈالتے تھے۔ ضعیفی میں شوق میں حفظ قرآن کا ہوا اور
...ال بھی اس پر کر گزرے۔ بظاہر اس سن میں حافظہ وہ کہاں سے آ سکتا تھا۔ یاد کرتے
اور روزانہ مکرر اعادہ نہ رکھتے تو پھر ذہن سے وہ جز نکل جاتا۔ خط میں حکیم الامتؒ کو لکھا
...ہی والی کوشش تو کی ہے اب دعا فرمایئے کہ یاد بھی رہ جائے۔ جواب آیا جس نے
...س عمر میں اپنا کلام یاد کرنے کی ہمت دی اس کے یاد کرنے کی بھی توفیق دیگا۔
سفر کے بڑے عادی تھے۔ عمر کے آخری دو ڈھائی برسوں کو چھوڑ کر جب سن ضعف
و امراض کا اثر جسم پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ معمول ہمیشہ سیاحی ہی میں رہنے کا تھا۔ آج
...یہاں کل وہاں۔ ابھی اس شہر میں ابھی اس شہر میں، اور کبھی ایک ہی شہر کے اس محلے اس

محلے میں اور مالک مکان یا میزبان کو خبر تک نہیں ذی مروت اتنے کہ کسی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہ تھے اہل حاجت اپنی غرض کے آگے اندھے باؤلے مسلسل نقل و حرکت ہی میں رکھتے۔ ابھی اپنے ہاں کہہ کر کے گئے کہ دو گھنٹے میں واپس آئیں گے اور ابھی اپنا ہی مستقل مہمان بنا لیا، نہ کھانے کا ٹھیک نہ سونے کا جس نے جب اور جہاں پایا بس اپنے کام کے لئے گرفتار کر لیا۔ مزاج میں سکنت اور فروتنی اتنی کہ جہاں جگہ ملی وہیں پڑ لیٹے مسہری اور پلنگڑی کے بجائے کھرا تخت یا کھری زمین کا فرش ہی کافی۔ کھانے میں موٹا جھوٹا کسی غریب آدمی نے جو کچھ بھی پیش کر دیا بس اسی کو پوری رغبت اور شوق سے تناول فرما لیا۔ معمولات شبانہ میں اس کثرت سفر کے باوجود نہ فرق آنے پاتا بہت رات گئے تھک کر اور چور ہو کر لیٹے ہیں مگر پھر دیکھئے تو اپنے وقت پر اٹھ بیٹھے ہیں اور یا نماز پڑھ رہے ہیں یا دعاؤں میں مصروف ہیں یا اپنے اوراد پورے کر رہے ہیں۔

عملیات سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ بلکہ اس فن کے بھی ماہر تھے اور عوام کی اس صفت کے معتقد ہو کر ان پر پروانہ وار گرتے تھے۔ محض عوام ہی نہیں اچھے خاصے خواص بھی۔ اور ہر وقت تعویذ، نقش، گنڈے، فلیتہ کے لئے گھیرے رہتے تھے۔ حاجی صاحب کسی کو بھی محروم و ناکام واپس نہ کرتے سب کی تعمیل فرمائش اپنا فرض جانتے، موم بتیاں جلا کر تعویذ نقش وغیرہ لکھا کرتے کیا ٹھکانا ہے خدمت خلق کے اس شغف و انہماک کا اصل کمال تو ان بزرگ کا ان کی عبدیت و شکستگی ہمہ وقت تضرع و ابتہال تھا، لیکن ان کمالات پر نظر تو خال خال کسی کی جاتی ۹۵ فیصدی مخلوق محض ان کے "عامل" ہونے کی حیثیت سے ان کی گرد یادہ رہتی اور سفر و حضر میں صحت و بیماری میں رات ہو کہ دن کسی حال میں ان کا پیچھا نہ چھوڑتی تسخیر جنات کے قصے بھی اس سلسلے میں عجیب عجیب مشہور ہیں۔

باوجود کمال سوز و شورش و شوریدگی ضبط اور اپنے اوپر قابو بھی درجہ کمال ہی میں رکھتے تھے اور احترام شریعت میں تو وہ حوصلہ و اہتمام تھا کہ باوجود خاندان کی زندگی آزاد اور

بے قید درویشوں کے لئے ایک مکمل درس ہدایت تھی۔ عارف رومی نے تو ایک جگہ آداب و
داناؤں اور سوختہ جانوں کے دو گروہ الگ کرکے دکھائے ہیں اور صحیح دکھائے ہیں ؎

موسیا آداب دانان دیگر اند
سوختہ جانان در رواں دیگر اند

لیکن یہاں آداب دانی اور سوختہ جانی دونوں ایک ہی ذات میں متحد ہو گئی تھیں
شریعت کے ساتھ ادنیٰ استخفاف کو نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں فتنہ نگار کے سلسلہ میں
لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں مسلمانوں کا ایک جلسہ عظیم نگار کی ظلم آمیز تحریروں پر احتجاج کے
لئے منعقد ہوا۔ تو میں نے ڈائس کے اوپر سے دیکھا کہ ایک پیر مرد قریب ہی بیٹھے ہوئے جوشیلے
نعرے لگا رہے ہیں اور جوش سے بے خود ہوئے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک حاجی صاحب
کی خدمت میں نیاز حاصل نہ تھا۔ جلسہ کے بعد پوچھ پاچھ کی تو معلوم ہوا کہ بزرگ حاجی صاحب
ہی تھے۔ حالاں کہ مدیر نگار سے قرابت بھی حاجی صاحب کی قائم ہو چکی تھی۔

فیاض و عالی حوصلہ بھی اس درجہ تھے۔ روپیہ خدا معلوم کہاں سے آتا تھا۔ اپنے
عام نیازمندوں سے طالب امداد ہونا تو کجا الٹے خود انھیں کی مدد اور وہ بھی اچھی خاصی
رقموں سے فرمایا کرتے تھے۔ سو اس کو قرض دے رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو اس کو اور یہ قرض
بھی نام ہی کا قرض ہوتا تھا۔ دی ہوئی رقم وہ واپس قبول ہی کب کرتے تھے؟ مخلصانہ
نذر لوگوں کی قبولیت خاص خاص مخلصوں تک محدود تھی۔ بدعتی رسوم اور رواج پرستی
والے رواجی تصوف سے منزلوں دور تھے۔ البتہ خلق مروت و نرم دلی کے باعث اہلِ
بدعت پر کبھی زیادہ سختی نہ کرتے۔

دن رات میں خدا معلوم کتنی بار روتے اور رلاتے رہتے۔ امت کی سابقہ عظمت
کا ذکر آیا اور آن کے آنسو بہنے لگتے۔ ملت کی موجودہ پستی کا نام آیا اور انہیں گریۂ بے اختیاری
طاری ہو گیا۔ مخلص روتے ہی نہیں اسی حالت میں جوش و خروش کے ساتھ تقریر

بھی کرتے اور اللہ سے دعائیں بھی مانگتے کہ حق کے تو گویا امام ہی تھے، میں نے یہ جامع ا
پُر اثر دعا، انھیں کی زبان مبارک سے سنی اور سیکھی۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ ذُنُوبَنَا وَاسْتُرْ عُیُوبَنَا	اے اللہ ہمارے گناہ بخشدے اور ہمارے عیوب
وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا وَاحْفَظْنَا قُلُوبَنَا	ڈھانپ رہ اور ہمارے سینوں کو کھول دے اور
وَنَوِّرْ قُلُوْبَنَا وَیَسِّرْ لَنَا اُمُوْرَنَا	دلوں کی حفاظت رکھ اور ہمارے دلوں کو
وَحَصِّلْ مُرَادَنَا وَتَمِّمْ تَقْصِیْرَنَا	کر دے اور ہمارے معاملات کو آسان کر
اَللّٰھُمَّ نَجِّنَا مِمَّا نَخَافُ یَاخَفِیَّ	اور ہماری مرادیں عطا کر دے اور ہماری کوتاہ
الْاَلْطَافِ	کو پورا کر دے اے اللہ ہمیں ہر اس چیز سے نجا
... ...	دے جس سے ہمیں ڈر معلوم ہوتا ہے اے لطف
... ...	کی دھن میں لگے رہنے والے۔

فرض نماز کے بعد جب سلام پھیر کر اور دعاؤں کے ساتھ یہ دعا، پڑھتے تو مجسم الحاح
تضرع بن جاتے اللہم نجنا مما نخاف اس فقرے کو دو دو تین تین بار اور بڑے جوش و خر
کے ساتھ ادا کرتے، داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

ہمارے گھر بھر پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ عورتیں ان کی بے طرح معتقد تھیں۔
کوئی بیمار ہوا یا اور کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوئی بس فوراً خط آیا آدمی حاجی صاحب
پاس دوڑا گیا اور آپ ہر ممکن دعا و تدبیر میں لگ جاتے۔ حضرت تھانوی کی وفات
بعد ہم لوگوں کا بڑا سہارا ایک انھیں کی ذات رہ گئی تھی اپنے مقبولین کا سہارا اس کے
ے ہاتھ کب آتا ہے؟ تقسیم ملک کے بعد جب سے لکھنؤ کے مشہور مدرسہ فرقانیہ پر زوال
شروع ہو گیا تھا حاجی صاحب اب اس کا بڑا آسرا رہ گئے تھے۔ خود وہیں جا کر مستقل
اختیار کر لیا اور ہمت کر کے اُس کی گرتی اور ڈھتی ہوئی حالت کو سنبھال لیا۔
حرم پاک کی خاک تو اتنی مرتبہ چھانی تھی کہ گویا وہیں کے ہو گئے تھے۔ حجاز

دروازو پر سعادت سفر اس ضعیفی میں اور ظاہری عسرت کے باوجود ان کے نزدیک کوئی
ہی نہ تھے ابھی معلوم ہوا کہ بمبئی گئے ہیں اور ابھی خبر سنائی دی کہ جہاز پر بیٹھ کر فلاں فلاں
اپنے ساتھ لے کر مکہ روانہ ہو گئے اور جن لوگوں نے حاجی صاحب کو حرمین میں دیکھا ان کا بیان
وہاں پہونچ کر حاجی صاحب بوڑھے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے بس نوجوانوں کے ایک جوان ہو
تے تھے نہ پیادہ چلنے سے تھکن نہ کھڑے رہنے سے. مدینہ منورہ میں مواجہ شریف کے سامنے
ے ہوئے سلام پڑھ رہے ہیں یا دعائیں کر رہے ہیں تو بس اب کھڑے ہی ہوئے ہیں. جوان
تھک کر بیٹھ گئے ہیں لیکن ان کے ہاتھ دعا کے لئے اُسی طرح اٹھے ہوئے ہیں روتے جاتے
اور رو رو کر درد دل اس طرح سنانے جا رہے ہیں حق تھا کہ یہ خاک کا پتلہ وہیں کی خاک کا
ہے اور ایسے عالم میں دعوتِ اجل کو لبیک کہے کہ حشر تک مسلسل حج ہی میں گزرے وہی ہوا
بندے نے چاہا وہی اس کے مولا نے بھی چاہا۔ ؎

توچنیں خواہی خدا خواہد چنیں
می دہد یزداں مرادِ متقیں

برائے نام بیماری کے بعد یہ اپنے رب کا عاشق اور متوالا اور اس کے رسولؐ کے نام کا
۹ ذی الحجہ کی سہ پہر کو احرام پہنے ہوئے اپنے مالک و مولا سے جا ملا اور وصال کی شب کو
شب عرفات میں قبل عشا، مکہ معظمہ کے مشہور گورستان "جنت المعلیٰ" میں صحابیوں اور اولیا
کے جوار میں راحت کی ابدی نیند سوگیا. وہی یوم عرفات جس کے لئے دنیا کے سب
بڑے سچے کا ارشاد ہے کہ شیطان آج سے زیادہ مایوس کسی دن نہیں ہوا۔؟
قیامت تک رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی رہیں اس کی تربت پر !

پیکرِ اخلاص کی وفات

ہندو پاکستان کے مسلمانوں میں کوئی مجھ سے اگر فرمائش کرتا کہ دس مخلص ترین انسانوں کے نام بتا دو، تو اس ننھی منی سی فہرست میں میرے علم و یقین کے مطابق ایک نام مولوی حافظ لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کا ضرور رہتا۔ افسوس ہے کہ وہ شمع اپنے وطن میں ۲۳ر جنوری (۱۴ر ذی قعدہ) کی شام کو بجھ کر رہ گئی۔ مخلص نایاب نہیں۔ ماشاء اللہ ابھی بڑی تعداد میں ہیں لیکن لقاء اللہ عثمانی ان میں گل سرسبد تھے۔ بڑے بلند اور امتیازی مرتبہ کے تھے۔ بیعت حضرت تھانوی سے تھے۔ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات میں شیخ کے زیرِ عتاب بھی ایک عرصہ تک رہے لیکن بالآخر بحال ہو گئے۔ قومی و ملی کاموں میں بہت پیش پیش رہے۔ کامل تدین و اخلاص کے ساتھ۔ ادنیٰ ادنیٰ خدمت گار کے ساتھ گھل مل کر کام کرتے۔ اور دوسروں کی خدمت ہی کر کے خوش ہوتے۔ جب میں انگریزی تفسیر و ترجمہ قرآن کا کام کر رہا تھا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مرحوم اس وقت وہیں تھے اور قلیل معاوضہ پر ایک ملی خدمت کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے تو مجھے اٹھا کر تنہائی میں لے گئے اور بڑی لجاجت سے بولے کہ میری ایک نذر قبول کر لیجئے۔ جیب سے ایک روپیہ نکالا اور بڑی خاکساری سے ہاتھ بڑھا کر کہا اتنی قلیل رقم پیش کرتے مجھے شرم آتی ہے لیکن آپ قبول کر کے میری ہمت افزائی کریں گے۔" میں نے عرض کیا کہ مولانا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کے عطیہ کو تبرک سمجھ رہا ہوں اور اسے شریک کر لینے سے خود اپنی عزت افزائی سمجھ رہا ہوں۔ ایسی حلال کمائی کا جز نصیب کسے ہوتا ہے"!

گاندھی جی کو ۱۹۴۷ء میں جن دو چار مسلمانوں پر آنکھ بند کر کے بھروسا تھا۔ ان میں ایک یہ حضرت بھی تھے۔ اور گاندھی جی کا منصوبہ یہ تھا کہ اسپیشل ٹرین لے کر جب

از صدق جدید ۷ر فروری ۱۹۶۹ء

ستان جائیں گے یہاں سے ہندوؤں کو واپس لے جانے کے لئے اور ادھر سے واپسی میں مسلمانوں
ساتھ لاکر یہاں از سرِ نو بسانے کے لئے تو جو مسلمان مشیروں اور معاونوں میں ان کو
رساتھ رکھیں گے ـــــ ۱۹۴۷ء میں دہلی ہی کی طرح پانی پت کے مسلمانوں پر بھی قیامت
لیکن اس محترمہ توکل نے کسی طرح ترکِ وطن گوارہ نہیں کیا اور بالآخر اسی آگ کی بھٹی
نے حق میں گلزار بنا لیا! ـــــ کل دو ہفتے ہوئے ار جنوری کا لکھا ہوا تعزیت نامہ
رفیقۂ حیات مرحومہ کے سلسلہ میں آیا تھا کہ آپ نامناسب نہ سمجھیں تو ان کا نام مجھے لکھ
یں تاکہ میں اپنی ایصالِ ثواب والی فہرست میں ان کا نام درج کر لوں۔ اور پابندی
کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں کون جانتا تھا کہ اتنی جلد خود دعا کرنے والا اسی
یں پہونچ جائے گا۔ !

سلف صالحین کی ایک صحیح اور سچی یادگار تھی آخر ہماری ظاہری نظروں سے
پوش ہو گئی۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ

مولوی عبدالحلیم صدیقی مرحوم

لکھنؤ کی خبر ہے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے یکم فروری کو ملیح آباد ضلع لکھنؤ میں وفات پائی۔ ایک لمبی مدت سے فالج میں مبتلا تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جمعیۃ العلماء ہند کے نامور خدمت گزاروں میں تھے۔ اور مدتوں اس کے عہدہ داروں میں رہے۔ خلافت کمیٹی کے بھی ممتاز کارگزاروں میں رہے اور جیل بھی گئے۔ برسوں دارالعلوم ندوہ میں اور اس کے بعد برسوں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں معلمی کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت مولانا حسین احمد سے نسبت و بیعت اجازت خلافت تھی۔ مشاق اور بے تکان بولنے والے تھے۔ وفد کے ممبر کی حیثیت سے حجاز بھی گئے۔

لکھنؤ، دہلی، بمبئی، بھوپال وغیرہ ہندوستان کے ہر حصہ میں معتقدین اور جاننے والے کثرت سے ملیں گے۔ اسلامی و عربی علوم خاص مناسبت صرف و نحو سے تھی۔ راقم السطور نے کئی بار عرض کی کہ اعراب القرآن کے موضوع پر جدید و مکمل کتاب اپنے قلم سے لکھ دیجئے۔ دیسول کو خوب کھلاتے پلاتے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی خاطرداریوں میں لگے رہتے۔ اپنی خوبیوں کی بنا پر اپنے نیازمندوں کو مدتوں یاد آتے رہیں گے۔ اچھے جید حافظ قرآن تھے رمضان شریف میں تراویح خوب ہی پڑھاتے تھے اور سنہری مسجد (دہلی) میں سننے والے بڑے شوق سے جمع ہو جاتے۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ

صدق جدید ۱۰ فروری سنہ ۱۹۶۲ء

افضل العلماء عبدالحق کرنولی مرحوم[۱]

---

۱۸ مارچ سہ پہر کو تازہ ڈاک دیکھ رہا تھا کہ نظر معاصر الجمعیۃ کی ایک نمایاں خبر پر پڑی کہ ڈاکٹر عبدالحق چیئرمین مدراس سروس کمیشن کا دفعتہً انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔ زبان پر اضطراراً انا للہ، لیکن دماغ کے اندر ایک شدید ہیجان و تلاطم برپا، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ عبدالحق ہرگز نہیں۔ یہ ذکر ان کے کسی ہم نام کا ہوگا۔ خبر پھر پڑھی، اور پھر پڑھی، پُرنم آنکھوں کے سامنے الفاظ بھی دھندلے ہو گئے۔ عبارت پوری پڑھی بھی نہ ہو گی پھر اتنی تو چل ہی گئی کہ مفہوم سمجھنے میں کوئی شک و اشتباہ نہ رہا۔ ایک دو سکنڈ بھی بہت ہوئے اسی مدت کے اندر دماغ اسی طرح تہ و بالا ہو گیا۔

اونچے سرکاری عہدہ دار تھے اسٹیٹسمین وغیرہ انگریزی روزنامہ میں ضرور نکلی ہو گی۔ لیکن میری نظر سے اس دن کہیں اور نہیں گزری ــــــ ہند کے موجودہ انگریزی اخبارات کے تجربے مسلمان اکابر و مشاہیر کی وفات کے سلسلہ میں، بخل کے بھی اچھے خاصے ہو چکے ہیں۔ ابھی اسی جنوری کی ۲۶ جنوری دس بجے مجھے کسی طرح ہنسی خوشی کرنول اسٹیشن سے رخصت کیا تھا۔ کیسے خوش و خرم توانا تندرست ہشاش بشاش اس وقت تھے وہی چہرہ نظر کے سامنے برابر پھرے جا رہا تھا۔ دعائیں بار بار اور دیر تک۔ مرحوم کی مغفرت اور بلند درجوں کے لئے مانگیں۔ یہ بھی گویا اضطراراً ہی تھا ورنہ پختہ مومن

---

[۱] صدق جدید ۱۰ مئی ۱۹۵۰ء

و مرد صالح کے لئے دعائے مغفرت بس ایک تحصیل حاصل ہی تھی۔

مرحوم کا نام اول اول محمڈن کالج مدراس کے پروفیسر اور پھر پرنسپل کی حیثیت
سے سننے میں آیا پھر وہ شاید اسسٹنٹ ڈائرکٹر بننے کے بعد سرکاری پریسیڈنسی کالج کے
پرنسپل ہوگئے۔ یہ اس وقت ایک ہندوستانی خصوصاً ایک مسلمان کے لئے غیر معمولی اعز
تھا۔ کوئی چھ مہینے کے لئے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر اور پھر قائم مقا
وائس چانسلر رہے اور اتنے ہی دن میں کیا اپنے قول اور اپنے ظاہر سے اور کیا اپنے عمل او
باطن سے لڑکوں اور استادوں دونوں میں ایک اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی گو
وقار الملک مرحوم کا دور لوٹ آنے لگا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ترکی ٹوپی
۴۷ء کے بعد سے اردو ہی کی طرح غیر ملکی یا پاکستانی قرار پا چکی تھی از سر نو سروں پر نظر آنے لگی تھی
وطن جاکر اپنے صوبے کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوگئے اور حال ہی میں ترقی پاکر اس
کے صدر ہوگئے تھے۔ افضل العلماء کی سند مدراس یونی ورسٹی سے پاس کرکے حاصل کی تھی
اور خان بہادر کا خطاب انگریزی حکومت سے پا چکے تھے

وطن کرنول (علاقہ آندھرا) تھا والد ماجد مولانا محمد عمر نقشبندی، کہ ان کے انتقال
کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا، ایک بڑے پائے کے عالم تھے۔ تعلقات بزرگان دیوبند و نیکان ندو
دونوں سے مخلصانہ اور گہرے رکھے ہوئے تھے، ہونہار صاحبزادہ کو خوب انھوں نے مشرقی تعلی
اور دینی تربیت سے آراستہ کیا۔ بہت کم سنی میں سارے علوم سے فراغت کرلی۔ افضل العلماء
ہوئے۔ پھر انگریزی کی طرف توجہ کی اور کھٹا کھٹ امتحان پاس کرنے شروع کردیئے۔ کچھ ہی
دنوں میں ایم۔ اے پر جاکر دم لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹریٹ (ڈی فل) کی ڈگری آکسفور
دو بار جاکر رہے اور حج بیت اللہ کی سعادت بھی دو ہی بار حاصل کی نظر اور گہری
نظر یوں تو خدا معلوم کتنے علوم و فنون پر رکھتے تھے، لیکن موضوع اصلی

دو تھے ایک عربی ادب دوسرے تاریخ اسلامی۔ معقولات قدیم سے بھی ذوق کچھ کم نہ تھا۔
یخ الاشراق شہاب الدین مقتول سہروردی کی کتاب ہیاکل النور پر شرح ملا جلال الدین
دوانی صاحب اخلاق جلالی کے قلم سے شواکل طور کے نام سے ہے۔ اسے ایک رفیق کے تعا
ترتیب وتہذیب کے بعد شائع کی اس پر عربی میں مقدمہ لکھا حاشیے دیئے اور وہ ڈگری
ی پر حاصل کی تازہ کارنامہ دیوان اکلیل الملک کی ترتیب تہذیب واشاعت ہے۔ آکسفورڈ
ے دوسری ڈگری شاید اسی پر ملی —— ذہین، حافظہ، ذوق سلیم، شوق علم وجستجو کے سارے
عنصر موزوں اکٹھے ہو گئے تھے۔ علم وادب کے جس کوچے میں بھی نکل جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے
جاتے اردو ادب کا بھی بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان کے عاشق تھے فسانہ
زاد کی عبارتیں صفحہ کی صفحہ کی ازبر تھیں

یعت حضرت تھانوی نے مراسلت کے ذریعہ سے ان کی کم سنی میں ہی منظور فرمالی تھی۔ اور
یہ امتیاز حضرت کے منتسبین میں نادر ہی کسی کے حصہ میں آسکا۔ اور مرشد کے ساتھ
یا نسبت عشقی قائم تھی دینی مسائل میں حضرت مولانا حسین احمد کے ساتھ بھی عقیدت
بڑی گہری تھی اور چونکہ طبیعت بڑی عملی واقع ہوئی تھی عقیدت کے دائرہ میں بھی اس کا
اظہار رکھتے تھے چنانچہ دو ہی چار سال ادہر جب مولانا کا جانا جنوبی ہند میں ہوا تھا تو
زول میں انھوں نے شیخ سے باقاعدہ درس حدیث (صحیح بخاری) کا دلایا۔ اور کم سے کم
یک درس کو تو پورا ایکارڈ میں بھر لیا۔ جس سے جب چاہے خود مستفید ہو لیتے اور دوسروں کو
ستفید کرتے۔ عقائد اہل سنت میں اس قدر راسخ اور پختہ ہونے کے باوجود تعصب کسی
بھی فرقہ سے نام کو نہ تھا "وہابی"، "بدعتی"، "خارجی"، رافضی یہاں تک کہ قادیانی سب سے
یکساں کشادہ دلی سے ملتے۔ درسگاہوں میں جب معلم مقرر کرتے ان کے ذاتی عقائد سے
ہیں زیادہ ان کے سامنے ان کی اہلیت ان کی استعداد ان کی ذہانت ان کی فرض شناسی اور

ان کے ظرف و اخلاق پر نظر رکھتے۔ اور کچھ ایسا ہی حال ان کی سرکاری زندگی کا بھی تھا۔
جس عہدہ پر بھی ہوتے مسلمانوں کی نفع رسانی میں بے دریغ اور دھڑا دھڑ لگے رہتے لیکن
کسی غیر مسلم کے ساتھ نہ ناانصافی کرتے نہ اس کی حق تلفی نہ کسی حیثیت سے اسے شکایت
کا موقع دیتے اور اس باب میں وہ سابق حیدرآباد کے سابق وزیر خزانہ اور پاکستان کے مرحوم گورنر
جنرل ملک غلام محمد کے سے تھے ـــــ شاہانہ ہیبت اور دینداری کے باوجود تقشف
چھو نہیں گیا تھا۔ خندہ روئی کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سے ملتے اور بجائے تنگ مزاجی یا جھنجلاہٹ
کے ہر کام بڑے ہی سکون خاطر و انبساط کے ساتھ نمٹاتے تھے۔ نفس مطمئنہ کی اصطلاح
صوفیہ نے جس معنی میں بھی استعمال کی ہو اس کی جھلک تو اس مرد مومن کی زندگی میں
بھی دیکھنے میں آ گئی۔

سرکار دربار میں جن مسلمانوں کی رسائی ہے ان میں اکثر سے اس نیاز مند کو بھی نیاز حاصل
ہے۔ اور بعض سے تو بے تکلفی کی حد تک بیشتر کے ہاں عالم یہی پایا۔

؎ جو بچے ہیں تو بچے ذرا جو کھری کہی دھرے گئے!!

(مصرع کے آخری ٹکڑے کو یوپی کے ایک پارلیمنٹری سکریٹری پر پوری طرح چسپاں ہوتے ہوئے
دیکھا) اس اکثری اور عمومی قاعدہ سے مستثنیٰ پایا تو عبدالحق کو جو وضع اور جو طریقہ اپنا رکھا
تھا اس پر آخر تک اسی طرح قائم رہے۔ وہی نماز وہی روزہ وہی معمولات وہی داڑھی
وہی ترکی ٹوپی وہی شیروانی وہی پاجامہ۔ خودداری کیا لطفی اور شخصی کی ایسی مثالیں کم اور بہت
کم دیکھنے میں آئی ہیں۔ ہر پارٹی، ہر تحریک، ہر فرقہ بندی سے بھی غیر متاثر رہنے کی کوئی دوسری
مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ عقیدت بزرگان دیوبند کے ساتھ انتہا کی تھی، لیکن اس کے
بھی حدود تھے اور توازن قائم تھا۔ سرسید کے مذہبی عقیدوں سے بیگانہ اور ان کی تعلیمی کوششوں
کے بڑے قائل اور مداح تھے۔ بلکہ جنوبی ہند کے حدود میں تو گویا دوسرے سرسید خود بن
گئے تھے۔ اسکول کالج دارالعلوم کتنے قائم کر دیئے اور کرا دیئے اور کتنی درسگاہوں کے

کے روحِ رواں اور سرپرست تھے، انھیں میں زنانہ درس گاہیں بھی تھیں، لیکن بے حجابی کے قائل ذرا بھی نہ تھے، اپنی والی ہر کوشش ہر زنانہ اسکول اور کالج میں پردہ کی پابندی کی رکھی، خود اپنی صاحبزادی کو ایم اے کرایا۔ لیکن مذہبی تربیت کے پورے لوازم کے ساتھ۔ چنانچہ وہ ایک والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ حج بھی کر آئی ہیں، اور حجاب کا یہ اہتمام ہے کہ میں نے اسی گھر میں اپنے آٹھ دن کے قیام میں ایک بار بھی انھیں یا ان کی والدہ کو برقع کے ساتھ بھی باہر نہیں دیکھا۔ کسی کو سخت سست کہنا اور غیبت کرنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے یہ بات چھوٹی اور معمولی نہیں، پس معاشرے میں غیبت و بدگوئی خصوصاً معاصرین کی، ایک مستقل عادت بن چکی ہو، اور عوام نہیں، خواص بھی، بری طرح اس میں لت پت رہتے ہوں، وہاں زبان پر اتنا قابو رکھنا ایک بڑا اور غیر معمولی وصف سمجھا جائے گا۔ بلکہ ایک طرح کا مجاہدہ۔ ولا یلقاھا الا الصابرون۔ بعض اوصاف ایسے تھے کہ ان کی بنا پر ان پر گمان ولی اللہ ہونے کا گزرتا تھا۔ جس دن اپنی محبوب لڑکی کا عقد کیا اسی دن بستی کی ایک نہیں سات یتیم لڑکیوں کا بھی عقد کر دیا اور اسی ساز و سامان کے ساتھ! اس کی اہمیت و معنویت ذرا سوچنے کے بعد ہی منکشف ہو گی۔ ہم جیسے دنیا پرستوں کا حال تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم سے اگر ہماری لڑکی کی شادی کے دن کسی دوسری لڑکی کے لئے امداد چاہی جائے تو الٹا غصہ آ جائے، اور ہم مانگنے والے پر برس پڑیں کہ یہاں اپنی ہی لڑکی کے لئے انتظام کس مشکل سے ہو پایا ہے کہ یہ چلے ہیں سوال کرنے!۔ کیا ملکوتی ظرف تھا، جس نے فیاضی کو اس موقع پر، اور اس پیمانہ پر راہ دی!

بزرگی، مقبولیت، عبدیت کسی مخصوص طبقہ کی جاگیر نہیں۔ لوگ اہل اللہ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو اپنی نظریں صرف بندگی کی جگہوں، آستانوں، درس گاہوں، خانقاہوں تک محدود و محصور رکھتے ہیں۔ کسی کو کیا خبر کہ زندگی کے ہر کوچہ اور ہر گوشہ میں کیسے کیسے

صاحبِ دل موجود ہیں! اس تباہ کار کو اپنی زندگی میں اچھے اچھے بزرگوں کی صحبت رفاقت کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ لیکن نگاہ عیب بین کو سابقہ کے بعد اکثر یا ویسی ہی نصیب رہی گنتی کے دو ہی چار ہستیاں ایسی ملیں جہاں عیب جو ئی کی نگاہ ٹھٹک کر ناکام رہی اور انھیں مستثنیات میں ایک ذات ان مرحوم کی تھی۔ انکساری، اخلاص، ایثار و شرافت کا ایک چلتا پھرتا پتلا تھا۔ جسے لذت ہی خدمت خلق میں آتی تھی، مجھ سے سن میں کل ۸۔۹ سال چھوٹے تھے اور علم میں اور دنیوی اعزاز میں جو مرتبہ تھا، وہ ظاہر ہی ہے۔ مگر برتاؤ یہ رکھا تھا کہ جیسے مجھ سے ۲۰۔۲۰ سال چھوٹے اور ہر طرح میرے ماتحت ہی ہوں۔ مدراس و کرنول دونوں جگہ ان کی مرجعیت و مقبولیت کا عالم دیکھ کر دل وہم آشنا نے یہ کہا کہ ایسا نہ ہو۔ یہ قبول خلق کا فتنہ انھیں بے ڈالے، چنانچہ آخری مصافحہ کے ساتھ جب گاڑی پر بیٹھنے لگا ہوں، اور انھوں نے اپنے عا انکسار و تواضع کے ساتھ دعا کی فرمائش کی، تو زبان پر الفاظ کچھ اس قسم کے آسکے تھے کہ اللہ کے اخلاص کو قائم رکھے بلکہ روز افزوں اس میں ترقی دے، اخلاص پیدا ہو جانا زیادہ دشوار نہیں، اصل مشکل اس کو قائم و برقرار رکھنے کی ہے قبول خلق کی لذت نفس کے لئے بڑی جاذ حکیم مطلق کی حکمتوں اور مصلحتوں کے سامنے کون دم مار سکتا ہے ورنہ ظاہری عقل تو ہم حقیر بندوں کی یہ سمجھنے سے بالکل عاجز ہے کہ ہمارے اپنے صوبے میں ایک بہترین دینی خدمت گزار کو نسبتاً کم عمری ہی میں مفلوج کر کے بے کار کر دیا گیا اسی طرح اس کل ہند مخلص ترین و سرگرم ترین ملی خدمت گزار کو عین اس کی توانائی کے زمانہ میں بے نشان وگمان دفعۃً اٹھا لیا گیا! ــ یہ بھی یقیناً رحمت ہی کا ایک کرشمہ ہو گا۔ کہ بس بندے امتحان پورا ہو گیا۔ حیات سعادت کی امانت جو عطا ہوئی تھی اس کا حق تو نے ادا کر دیا۔ اب مزید تعب و مشقت اٹھانے کی اور اپنے وطن اصلی کی بے حد و حساب راحتوں سے دور رہنے کی ضرورت اب ایک لمحہ ایک پل کے لئے بھی نہیں! اور فوراً آ۔ کہ انعامات اب خود تیرے لئے خود تڑپ رہے ہیں۔ ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیۃً فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

~~~~
~~~~

شیخ التفسیر کی وفات[1]

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ آگیا آخر

مہینوں نہیں بلکہ شاید برسوں موت و زلیست میں جھولنے کے بعد شیخ التفسیر ندوۃ العلماء مولانا محمد اویس ندوی نے جمعہ ۸ ر اگست لکھنؤ میں وفات پائی۔ یہ ندوی عالم نگرامی تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا محمد انیس نگرامی اور ان کے دادا مولانا محمد ادریس (صاحب احکام القرآن) تھے۔ یہ خاندان اہل علم کا تھا۔ اس میں ان کے ایک عزیز قریب مولانا عبدالرحمن نگرامی ندوی شیخ التفسیر تھے (متوفی ۱۹۲۶ء) اور مولوی محفوظ الرحمن اور مولوی مطلوب الرحمن۔

مولوی اویس کو شروع ہی سے ندوہ اور اہل ندوہ کی تربیت ملنے لگی تھی، تقریر و تحریر دونوں میں ہونہار نکلے۔ دار المصنفین خاص تربیت گاہ رہی اور ان پر مولانا سید سلیمان ندوی کی نگاہ کرم خصوصیت سے رہی۔ معارف میں ان کے مقالات خاص طور پر جگہ پاتے گئے۔ مولانا عبدالرحمن نگرامی سے نہ صرف تفسیر قرآن کا درس لیا بلکہ علم و فضل، اخلاق، ملنساری اور تواضع میں بھی ان کے قدم بہ قدم رہے۔

⁂
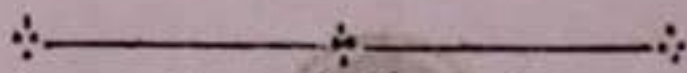
ابن قیم کی تفسیریں جستہ جستہ کر کے اکٹھی کیں اور دیکھا جائے کہ بہتر طریقے سے ایڈٹ کیں۔ اس طرح سے تفسیر ابن قیم وجود میں آگئی۔ اور اپنے دادا مولانا ادریس کی ایک فقہی تفسیر کے دوسرے ایڈیشن کو اس وقت ایڈٹ کر رہے تھے۔ قرآنی تالیفات کا بہترین ادارہ قائم کر رہے تھے اور بیسیوں نہیں پچاسوں قرآنی موضوعات تیار کر چکے تھے۔ اپنے محترم و شفیق استاد مولانا سید سلیمان ندوی کی کلاسیکل سیرت النبی کے نئے اڈیشن پر نظر ثانی شروع سے آخر تک کر ڈالی

---

[1] صدق جدید ۱۰ ر ستمبر ۱۹۷۰ء

ہی پر تو تصنیف و تالیف ہوئی۔ باقی تعلیم و تدریس کا تعلق ہے اس میں عمر عزیز کے سالہا سال گزارے۔ اور اپنے درس میں قرآن مجید سے خاص ذوق اپنے شاگردوں میں پیدا کر دیتے تھے۔

تفسیروں میں روح المعانی (آلوسی عراقی) سے خاص ذوق رکھتے تھے اور دوسری مستند تفسیروں پر اگرچہ پورا اعتقاد رکھتے تھے لیکن کسی کے قول سے انکار نہ تھا۔ اور ہر مناسب قول کو قبول کر لینے پر تیار رہتے تھے۔ اور اس اعتبار سے اپنے معاصرین و ممتاز و نادر تھے۔ بقول ماجدی میرے علم میں تین شخص حسن ظن انتہائی مبالغہ کے ساتھ رکھتے تھے اور اب یہ تینوں شخص دنیا سے سفر کر گئے ان میں ایک مولانا عبدالباری ندوی دوسرے شفاء الملک حکیم شمس الدین اور تیسرے یہی مرحوم۔ اللہ انھیں بڑے سے بڑے مرتبہ پر پہونچائے۔

سیاسی لیڈر

محمد علیؒ

○

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت بھی بن سکتی ہے؟ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اس رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں صحتوں کے لئے۔ گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت اُسے اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی۔ اور جس کی موت "اللہ کا نام" جپنے والوں کی موت محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے! اس پچھلے زمانہ میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لئے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر اتحادیوں کا "نرغہ" ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اُڑی، مصر کا سردار اُٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین پھٹی، یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا، ایک محمد علی کا دم، ہر زخم کے لئے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اس خیال سے کہ جو کچھ بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لئے منادی کردی کہ ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک محمدؐ کا ایک ادنیٰ غلام محمد علی کے لئے بھی یہی صدا پہونچا دی۔

سچ لکھنؤ ۱۹۳۱ء

اے پاک پروردگار! اے سب کو جِلانے والے اور سب کو اٹھانے والے مولا، تیرا ارادہ بےشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب؛ مشیت بلاشبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر ہے؛ لیکن کیا ہم جیسے ناتواں و کمزور بندوں کا ظرف اتنی سخت آزمائش اتنے بڑے ابتلا نے کڑے امتحان کے قابل تھا! ایسی آزمائش تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہے ہم کم ظرف لائق تھے کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں تیرے فضل و کرم بھیک کے لئے تیرے آگے ہاتھ پھیلاتے گڑ گڑا رہے ہوں، عین اُس وقت ہماری سب سے زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی، ہماری سب سے عزیز پونجی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے، اور دل یہ مانتا تھا جس کی موت کی خبر کبھی نہ سُننی پڑے اُسے دم توڑتے آنکھوں سے دیکھیں، اور لاشے کو اپنے کاندھے پر اٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی بھی نہیں لایا جا سکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کی خبر رکھنے والے مالک! انصاف تیرے حبیبؐ و محبوبؐ کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب نہ لا سکا، تو تیرے اس حبیب پاکؐ کے ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمائش کا تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لئے پھر کس سے مانگ کر لائیں۔
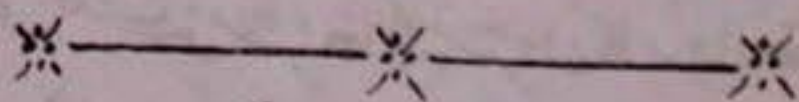
جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں قومی لیڈر اٹھ گیا، نیشنل کانگرس کا سابق صدر چل بسا، ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت یہ سب کچھ صحیح ہوگا، لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا، کہ اللہ کا بندہ اٹھ گیا، اپنے پرستار چل بسا، محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا! آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک

جادو بیان مقرر اور بہترین انشا پرداز گم ہوگیا۔ ماتم اسی کا ہے کہ وہ گم ہوگیا۔ جو سچائی کا پتلا تھا۔ جو حق گوئی کا مجسمہ تھا۔ جس نے اپنی دنیا برباد کرکے اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا۔ جس نے زریں لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی۔ جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی۔ جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ و ہر آن اگر تڑپ تھی تو رسول کی نصرت و خدمت کی، اس کی سچی آپ بیتی خود اسی کے ایک شعر میں سنئے ؎

سب کھو کے تیری راہ میں دولت دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے!

بیشک اس نے دنیا نے، اور دولت دنیا ساری کی ساری کھو کے رکھدی، اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا پاتے ہوئے اور ملتے ہوئے کی جھلک کسی کسی نے آج بھی دیکھ لی اور کل – انشاء اللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت نا موری، شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڑھ میں نام پیدا کیا۔ آکسفورڈ جاکر ناموری کہاں سے کہاں پہونچی "سول سروس" کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کئے گئے بڑوڈہ اور رامپور دونوں کی قدرشناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ سے مانگی گئی تھی ——— کہ میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنا دے" ساتھ نہ چھوڑا جو نہ صرف "مسٹر" تھا بلکہ مسٹروں کا سردار تھا۔ دیکھتے دیکھتے نورانی تھا چہرہ پر داڑھی، سر پہ ترکی ٹوپی، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سودا جنون کی تڑپ!! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی ایک جوشش تھی جو ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کی آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک

کرمر یا۔ قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کمر ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش کہ عمر بھر کے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمعیۃ العلماء سے جنگ، پنجابی ٹولی سے جنگ، بنگالی ٹولے سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلحدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی، اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں تک سے جنگ! التصدق شیروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لئے ساری خدائی سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر اللہ کے لئے سب سے لڑا اور خوب لڑا۔ شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا کہ اگر آج ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

⁂

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا، خبطی ہو گیا کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے نہ کسی کی دلشکنی کی پرواہ، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے، کوئی کہتا کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات چل رہے ہیں۔

کہ تردید بھلا دو کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا، کوئی صاحب فرماتے کہ کونس
اور اسمبلی میں جانے کے بجائے شور وغل میں پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضائع
کیا۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا کہ جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جانا چاہیے تھا تاریخ پر ریسر
کے بعد کوئی محققانہ تصنیف کر لی تھی! اعتراضات صحیح تھے محمد علی واقعی "دیوانہ" ہو گیا
تھا اسے جو کچھ دکھایا گیا تھا اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا...... تو اس کی دیوانگی
میں کیا شبہ تھا۔ ؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی پرستی بآج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے کہ محمد علی کو
نیشنلسٹ ثابت کر دکھایا جائے وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانہ دیوانگی کہ اس مر
تک پہونچ چکا تھا جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے نہ "کمیونلزم" وہاں مد نظر صرف خال
کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو اتنا اونچا ہو چکا کہ اسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھ
گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے اور جو مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا اس
لئے باعثِ فخر جایا جا رہا ہے کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کی محبت کا پجاری تھا! بیشک
محمد علی بہت بڑا ہندوستانی تھا۔ اس کو اپنی ہندوستانی ہونے پر فخر تھا لیکن اس کی ہندوست
ماتحت تھی۔ اس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دونوں کا قائل تھا قائل مگر خدا کا تھا اور چونکہ خ
ہی نے وطن والوں کی خدمت بھی فرض رکھی ہے اس لئے وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے کرائی گئی اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری
نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب کئے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں
یہ سنت قدیم سے چلی آ رہی ہے قالوا یا صالح قد کنت فینا مرجوا قبل ہذا اتنہانا ان نعب

-تا یعبد آباؤنا و اننا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب۔

اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا۔ کسی کو دہکتی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی۔ کسی کے خاک اور خون میں تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا۔ کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی۔ کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کر دیا گیا اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لئے کیا یہ قانون بدل جاتا اور جس نے کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کا مزا دیکھ

اسے یوں چھوڑ دیا جاتا۔ مجنونوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو۔ مجنّوں اور عاشقوں سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لئے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکستِ نفس

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ
عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی تو جا اور خوشی خوشی جا جنّت میں اپنی جگہ لے۔ تجھے آج کون مُردہ کہتا ہے غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجہ شہادت رکھتی ہے اور پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے۔ والذین آمنوا باللہ و رسلہ اولٰئک ہم الصدیقون و الشہداء عند ربہم لہم اجرہم و نورہم۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لئے ہوئے عالم برزخ میں جنّت کی سیر کر

رہا ہے اور تیرے نیاز مندوں کو اپنی جگہ پر یقین ہے کہ بغیر اپنے دوستوں اور مخلصوں کے جم غفیر کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کریگا اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی۔ جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے رفیق خاص غلام حسین مرحوم اسسٹ ایڈیٹر کریسنٹ و ایڈیٹر ینگ انڈیا کے ماتم میں چند شعر کہے تھے۔ وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دیئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

بدو

بدنصیب قوم! رو اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہوگئی، تیرا والی وارث چل بسا۔ تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں؛ خستہ بخت ملت، آج تو یتیم ہوگئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہوگئی صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے ہیں؛ اللہ میں سب قدرت ہے ہر نیست کو ہست اور ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے۔ لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہہ کر اپنے دل کو سمجھائیں اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں۔؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علیؒ کی عمر ۵۳ سال کی ہوئی حضور انورؐ نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقاؐ کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آتا رہا ہے۔ قبل اس کے کہ مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے۔ خادم کا رشتہ حیات ہی منقطع کر دیا گیا۔ آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا کہ کل کس کس طرح نکل کر نہ رہیں گی؟

شوکت علیؒ

ایکؒ دَور کا خاتمہ

○

نظرِ تصور کو ۲۵۔۲۶ سال پیچھے پھینکیے۔ مسلم یونی ورسٹی کی نئی نئی تحریک کا وہ غلغلۂ بلند ہے، کہ ہر صدا اس صدائے صُور کے آگے دب کر رہ گئی ہے۔ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی (مجلس ترتیب آئین و ضوابط) کا اجلاس لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کی زیرِ صدارت قیصر باغ میں ہو رہا ہے باہر کے تقریباً سارے مہمان محمود آباد ہاؤس کے عالیشان و پر تکلف مہمان خانہ میں مقیم ہیں۔ ایک صاحب بہادر ایسے ہیں جن کی انگریزیت کی تسکین صرف انگریزی ہوٹل ہی میں ٹھہرنے سے ہو سکتی ہے اجلاس ہو رہا ہے کہ دوپہر کے وقت یہی "صاحب" جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لحیم و شحیم، گراں ڈیل، رنگ سُرخ و سپید وضع و صورت بالکل انگریز، مونچھیں خوب گھنی اور خوب چڑھی ہوئی کہ آنکھوں سے گویا شعلے نکلتے ہوئے! ــــــ یہ آنے والا تھا شوکت علی ــــ ۱۹۳۸ء کا مولانا۔ شوکت علی نہیں سنہ ۱۹۱۱ء کا مسٹر شوکت علی، محکمہ افیون کا ایک اعلا افسر علی گڑھ کا مشہور کرکٹ کپتان اور مشہور تر فدائی۔ ہٹ جھٹ اولڈ بوائے۔ چندہ بازوں کا سردار، بوڑھا نہیں، جوان شوکت علی۔ اور بوڑھا وہ ۶۵ سال کے سن میں بھی کب ہوا تھا؟ دنیا کی عمر اور ڈیڑھ سال کھسکتی ہے۔ دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخیں ہیں ــــ لکھنؤ میں وقت کی سب سے بڑی قومی مجلس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دھوم دھام سے ہو رہا ہے سہ پہر کے وقت کانفرنس کے مہمان، عیسائیوں کے مشہور زنانہ کالج ازابلا تھوبرن کالج

صدق دسمبر ۱۹۳۸ء

پر مدعو ہیں۔ جاڑوں کی شام آتے ہی دیر کیا لگتی ہے۔ نماز مغرب کا وقت آجاتا ہے اچھی اچھی لمبی داڑھیاں رکھنے والے، جبّہ و عمامہ والے حیص بیص میں ہیں کہ ایک سوٹ پوش 'نیچری' اٹھ کر وہیں مسیحی کالج کے برآمدوں اور کمروں میں نماز جماعت کے لئے اعلان کرتا ہے اور آ آکر ایک ایک مہمان سے خوشامد کرتا ہے کہ بھائی خدا کے لئے اس وقت نماز جماعت میں شریک ہو جاؤ، وضو نہیں ہے نہ سہی، اس وقت تو ہمیں عیسائیوں پر اپنی جماعت کا سکہ جمانا ہے۔ یہ وہی سوٹ پوش 'سیٹ' نواز شوکت علی تھی جس کا قالب اب بھی انگریزی ہے، جنگ طرابلس و بلقان کے تجربہ کے بعد اب پوری طرح مسلم ہو چکا ہے ــــ فقہاء ظاہر جو کچھ بھی فتوے دیں لیکن ہائے وہ ایک نماز بے وضو جو کتنی ہی باوضو نمازوں سے انشاء اللہ، اللہ کے یہاں افضل نکلے گی!۔ خون کے چند قطرے بھی اگر کپڑوں میں لگ جائیں تو نماز درست نہ رہے گی۔ لیکن شہید کا سارا جسم اسی ناپاک خون سے ڈوبا ہوتا ہے اور حکم یہ ہے کہ اس کو پانی سے پاک نہ کرو اسی حالت میں اسے اللہ کے حضور میں پہونچا دو!ــ

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است

ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

منظر بدلتا ہے اور ۱۳ء و ۱۴ء میں نہ وہ صفاچٹ چہرہ رہتا ہے، نہ چڑھی ہوئی مونچھیں اور نہ وہ زرق و برق انگریزی سوٹ! سر پر ہیٹ کی جگہ کلپاک، جسم پر ڈھیلا ڈھالا ترکی وضع کا موٹے کپڑے کا لمبا سبز کوٹ، چہرہ پر گھنی داڑھی اور لبیں کتری ہوئی ــ اب شوکت علی 'اسٹیشن کلب' کی جان نہیں انگریزی سوسائٹی کا منظورِ نظر نہیں۔ وہ نہیں جس پر لیڈیوں کی نظریں پڑیں اور جس کی طرف 'افسروں کے ہاتھ 'شیک ہینڈ' (مصافحہ) کے لئے بڑھیں وہی شوکت علی جو طالب علمی کے زمانہ میں نیچے درجہ کے طلبہ سے ان کی اچکنیں اور شیروانیاں اور کرتے اتروا کر سوٹ بوٹ میں ملبوس کراتا تھا۔ ان کے گلے میں ٹائیاں بندھوا تا تھا جسے مشرقیت سے گویا چڑھ تھی اور جو کہنا چاہیے کہ 'صاحبیت' کا باضابطہ بپتسمہ دیتا تھا۔

اب سر سے پیر تک مشرقی تھا اور ٹھیٹھ مسلمان، وہی شوکت علی جو کبھی علی گڑھ کا پرستار تھا
اولڈ بوائز لاج کا فرمانروائے خود مختار اب محض خادم کعبہ "ہے خادم محض کعبہ یا رب کعبہ
نہیں کعبہ کے خادموں کا خادم، کعبہ کے زائروں کا چاکر، سینہ پر مجلس خدام کعبہ کا نشان لگا
جب دیکھئے حاجیوں اور زائروں کی خدمت میں سرگرم! ـــــ مولیٰ کی کریمی کے رنگ
بے حساب اور بندہ نوازی کے ڈھنگ کیسے بے شمار ہیں۔ بھاگے ہوؤں کو کس کس طرح
پکڑ کر گھیر گھار لاتے ہیں اور منھ موڑے ہوؤں کو کس کس طرح کمندیں ڈال ڈال کر کھینچ
بلاتے ہیں۔

ــــــــ ــــــــ

اس کے بعد جتنے دور ہیں سب کی نظروں کے سامنے ہیں مقصود طول کلام نہیں
ہندوستان میں تحریک خلافت عبارت تھی انھیں دو بھائیوں علی برادران کی ذات سے
ہزاروں کے لئے جیل کی راہ آسان کر دی خود کانٹوں کا تاج بار بار پہنا کہ دوسروں کے
کانٹے پھول بن جائیں برسوں ہندوستان کے طول و عرض میں شمال سے جنوب تک اور مشر
سے مغرب تک گاندھی جی اور محمد علی کے ساتھ مل کر بے تاج کی بادشاہت کی مسلما
تو مسلمان، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں تک سے اپنا کلمہ پڑھوایا۔ اور لاکھوں کی ہمیں گو
کی زبان سے اللہ اکبر کے نعرے لگوا دیئے۔ اپنے مولیٰ کی بڑائی بکروا دی! اور پھر برسوں دو
بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ خوب سہہ لیا بھگت لیا۔ اب بیگانے نہیں خود اپنے بیگانے بن
تھے۔ اور جنھیں کل تک ناز تھا مولانا کی رفاقت پر ــــــــ
خدمت گاری پر، جو فخر و مباہات کے ساتھ آپس میں چرچا کرتے تھے کہ آج مولانا نے ہم
جو تکی پر لوٹ مار کھوایا۔ ان ہی نے وہ زبان درازیاں شروع کیں کہ شرافت کی آنکھیں نیچی ہو
اور متانت نے منھ پھیر پھیر لیا۔ دنیا بھر کا کوئی گندہ سا گندہ الزام نہ تھا کہ جو گندی سی گ
زبان سے اس پر نہ لگ چکا ہو۔ جو آج پھر کمال جرأت اور انتہائی جبت کے ساتھ ہر د

…را جا رہا ہے ۔ محمد علی قلب نازک تر اور دماغ حساس تر رکھتا تھا کئی برس قبل امتحان گاہ سے اٹھا لیے گئے۔
…ے بھیا" کو اپنے صبر و ضبط کا زیادہ دعویٰ تھا۔ امتحان گاہ میں سات آٹھ سال اور رکھے گئے۔
…دونوں بھائی دل میں خدا جانے کتنے الفاظ شمار و حساب سے خارج بول ڈالتے تھے۔ آخر زبان…
…گناہوں کا کفارہ کیونکر ہوتا کارساز بندہ نواز نے کیا خوب انتظام کر دیا۔ اُدھر دل و جگر
…پر ہر روز نشتر و خنجر چلتے رہے اُدھر سارے گناہ ایک ایک کر کے دھلتے رہے۔ قرب رضا کے درجے
…ایک ایک کر کے بڑھتے رہے۔ یہ سمجھے کہ ہم مظلوم ہیں غیب سے ندا آئی کہ مظلوم ہی یہاں مقبول ہیں۔

⁂ ~~~~ ⁂ ~~~~ ⁂
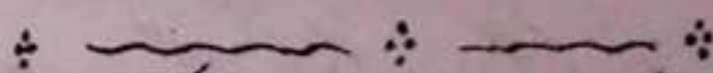
بزرگوں نے کہا ہے، کہ اللہ والا وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد پڑ جائے۔ شوکت مجذوب
…خصوصیت یہ تھی کہ شکل دیکھتے ہی اللہ اکبر کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔ اللہ کے نام کو
…کار پکار کر اتنی بار جپا، اللہ کے نام کی بڑائی اتنی بار خود پکاری، دوسروں سے پکروائی کہ خود
…ہی اللہ اکبر کا ایک مجسمہ بن کر رہ گئے تھے۔ ادھر نمودار ہوئے نہیں کہ ادھر نعرۂ تکبیر لگنے لگے۔
…ب کیا ذکر جہر کے سارے فضائل صرف خانقاہ نشینوں ہی کے حصہ میں آئیں گے۔ اور جس کے ذکر
…سے عالم کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا وہ محروم منھ دیکھتا رہ جائے گا۔!

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

…۱۹۲۴ء میں خلافت ہی نہیں ٹوٹی محمد علی کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اور برابر زیادہ ہی ٹوٹتا
…ا، شوکت کی موت خوب وقت کی منتظر رہی اِدھر وہ ہستی اپنے مولا کے حضور میں پہونچی
…جس نے خلافت توڑی تھی اور اُدھر وہ ذات بھی معاً طلب ہوئی جو خلافت ہی کے نام پر
…ی رہی تھی۔ بہشتی اب اسی آخری دربار میں ہو رہی ہو گی جس کے بعد کوئی دربار نہیں۔
…ور فیصلہ اسی عدالت سے ہو رہا ہو گا جس کے اوپر کوئی عدالت نہیں۔ اجتہاد حق و صواب
…کس کا تھا۔ انک میت وانہم میتون ثم انکم یوم القیٰمۃ عند ربکم تختصمون۔

⁂ ~~~~ ⁂ ~~~~ ⁂
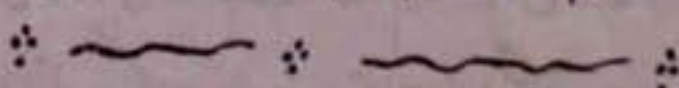
کہتے ہیں کہ کرکٹ کی شہرۂ آفاق کپتانی کے زمانے میں بیٹنگ، بالکل بے تحاشہ بے تکان اور بے پناہ تھی۔ گیند پر بلّے کو اس زور قوت سے مارتے کہ گیند وہاں پہونچ کر گرتی جہاں کوئی فیلڈر تو کیا اس کا وہم و گمان بھی نہ پہونچ پاتا۔ ۶۰ سال کی عمر کی یہ خصوصیت ۶۴-۶۵ سال کی عمر تک قائم رہی، میدان کرکٹ کا نہیں سیاسیات کا بھی ــــ جب وار کیا بے پناہ اور جب ہاتھ مارا تو اس زور قوت کے ساتھ کہ ساتھی اور تماشائی دنگ اور حریفوں کے چہرہ کا رنگ فق !

باؤنڈری اور اوور باونڈری ہٹ لگانے والے کپتان زندگی کی طرح موت کی بازی میں بھی جیت تیری ہی رہی جلوس زندگی میں ہزارہا نکلے اور ایک سے بڑھ کر ایک پُر شوکت۔ لیکن آہ ۲۸ نومبر کا جلوس میت! کیا کسی دولہا کی بارات اس دھوم سے چلی ہوگی! کیا کسی رئیس کی سواری اس شان سے نکلی ہوگی! کیا کسی سیاسی لیڈر کو اتنے سوگوار نصیب ہوئے ہوں گے! دیکھ لے شوکت ملّت کہ آج کتنی بیوائیں تیرے فراق میں بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ کتنے بچے تیری یاد میں تڑپ رہے ہیں، کتنے سفید ریش پیر مرد خود اپنے کو آج یتیم سمجھ رہے ہیں۔ کتنے جوانان صالح روتے پیٹتے تیرا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے میلوں پیدل چل رہے ہیں! ہزارہا ہزار کے اس مجمع سے دور ملک کے گوشہ گوشہ میں، شہر میں، دیہات میں جہاں کہیں بھی ایک اللہ کے ماننے والے آباد ہیں ہیں، گھر گھر تیرا ماتم کس اخلاص و دردمندی کے ساتھ برپا ہے! کروڑ دل کی آبادی کس درد دل کے ساتھ تیرا سوگ منا رہی ہے! کتنے ایسے جنھوں نے کبھی تیری شکل نہیں دیکھی تھی آج اپنی جگہ محسوس کر رہے ہیں کہ گویا خاص انھیں کا گھر بے چراغ ہو گیا ہے!
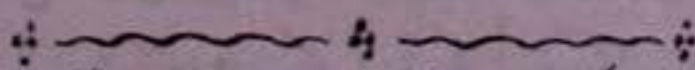
شوکت کی موت، تنہا ایک سپاہی کی موت نہیں، محض ایک جنرل کی موت نہیں پوری ایک نسل کی موت ایک مستقل دور کی خاتمہ ہے۔ شام ہونے لگتی ہے تو آفتاب کی حدت و تمازت پہلے دھیمی پڑتی ہے پھر آفتاب کے چہرہ پر زردی چھانے لگتی ہے یہاں تک کہ قرص آفتاب

ناب پوری غائب ہو جاتی ہے۔ جب دورِ تجدد و انقلاب کے پھیلنے کا وقت آیا تو کسی کی حیثیت کا یہ متقاضی اُس کی
نی کہ تہذیبِ محمدی کے علمبردار اور اتحادِ اسلامی کے منادی ایک ایک کر کے اٹھا لئے جائیں۔ پہلا بلاوا
محمد علی کا آیا پھر شاہ نادر غازی کی طلبی ہوئی اور پھر اقبال کی پکار ہوئی اور اب اس عمارت کے آخری
ستون کو بھی ہٹا کر راستہ بالکل صاف کر دیا گیا۔ شوکت علی آخری مسافر تھے۔ اس قافلے کے آخری
کار تھے دعایت خلافت اور تحریکِ اتحادِ عالمِ اسلام (صاحب کی اصطلاح میں پان اسلام ازم)
آخری ستون کے گر جانے سے راستہ صاف ہو گیا وطن کی پوجا کے لئے سوشلزم اور کمیونزم کی
ئی کے لئے اور نئے نئے ناموں کے ساتھ طرح طرح کے آنے والے فتنوں کے لئے۔ جیل جانے
والے تختۂ دار پر چڑھ جانے والے، اب بھی یقیناً پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن ملتِ اسلامیہ کے فروغ
رتی کے لئے، دینِ الٰہی کی نصرت کے لئے اپنا کاروبار مٹا دینے والا اپنی جاہ و مال دونوں کو ذبح کر
نے والا، اپنے سینہ کو گولیاں کھانے کے لئے پیش کر دینے والا اب کون اٹھے گا؟

وہ بات کچھ بکھن کی گئی کو بکھن کے ساتھ

کلمۃ الحق کے جہاد کرتا الگ رہا خود یہ تخیل قابلِ مضحکہ قرار پائے گا۔ اس پر آوازے کسے جائیں
س پر ٹھٹھے لگائے جائیں گے۔ اور اس کا نام زبان سے نکالنا تعزیرات ملک میں ایک سنگین
ٹھہرے گا۔

⁂ ــــــ ⁂ ــــــ ⁂

شوکت اعظم زہد و تقویٰ کا پیکر نہ تھا اس راہ کا مسافر ہی نہ تھا مست و دیوانہ تھا۔
درقلندر تھا لیکن دیوانہ اپنے اللہ کے نام کا۔ اور مست اپنے مولیٰ کے پیام کا۔ عمر بھر لڑتا ہی
آج اس سے جنگ کل اُس سے اور دشمنوں سے زیادہ خود دوستوں سے لڑا لیکن یہ
ی لڑائی بھڑائی یہ سارا شوقِ جنگجوئی، اُسی محبوب کی خاطر جو ہر قدرت والے سے بڑھ کر
اور ہر توانا سے زیادہ توانا ہے۔ مدت ہوئی میر تقی میر کا ایک شعر مثنوی زہرِ عشق کی
ن میں ایک صاحب کو پڑھتے سنا تھا ۔

دل پُر خوں کی اک گلابی سے　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے

الحمد للہ کہ ایسے "شرابی" کا نمونہ دیکھنے میں آگیا۔ اللہ کے نام کا ایسا مست اور متوالا اب کیوں دیکھنے میں آئے گا! کس کا دل اُمتِ محمدیہ کی دردمندی میں اتنا خوناخون نکلے گا۔؟ اور موت کے بعد رُوح تو ادھر اعلیٰ علیین کو سدھاری جسم کو جگہ کہاں ملی؟ ہائے حالی کا شعر، مرثیہ غالب کا یاد کر لیجئے۔　کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر

ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

جامع مسجد دہلی کے سامنے کا میدان، پشت کی طرف لال قلعہ، شاہان اسلام کی دنیوی عظمت و اجلال کی آخری یادگار، رُخ کی طرف مسجد کے در و دیوار گنبد و مینار اور شاہان اسلام کی دینداری کا نشان، سبحان اللہ وبحمدہٖ! اور پھر اپنے ہم مشرب سرمد مست کا جوار!۔ اللہ اکبر! شوکت مرحوم اپنی زندگی میں اپنے مدفن کے لئے کوئی جگہ تجویز کرتے تو اس سے بہتر اور کون سی ہوتی؟

جا خوش نصیب اور ناموروں کو بکٹر! فلاح امت و خدمت ملت کے میدان میں تیری باؤنڈریاں اور باؤنڈریاں قیامت تک زندہ رہیں گی اور تیری تربیت پر وہ لوگ بھی عقیدت کے پھول چڑھاتے رہیں گے جو زندگی میں تجھے کچوکے ہی دیتے اور تیرے دل دگبر کو لہولہان ہی کرتے رہے، تیری تربت کے ذرہ ذرہ سے یہ صدا گوش دل سے سننے والوں کے کان میں آرہی ہے۔

زمن بجرم تپیدن کنارہ کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر!

"شہید حق پرستیؒ"

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی!

گاندھی جی رخصت ہو گئے۔ دنیا جنھیں مہاتما اور دیوتا سروپ اور خدا معلوم کن کن تعظیمی ناموں سے پکارتی تھی، اپنے ملک، اپنی قوم سے دم کے دم میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ وہ کسی گورے کی سنگین سے نہیں، کسی پاکستانی کی تلوار سے نہیں، ایک ہندوستانی ننگِ ہندوستان ہندوستانی ہی گولی کے ذریعے ہلاک ہو گئے!۔۔۔ ایسی موت کو موت نہیں شہادت کہتے ہیں۔ شہادت اصطلاحی نہیں، شہادت جو حق پرستی کی راہ میں مظلوموں کی حمایت و نصرت کی راہ میں، دادخواہوں کی فریاد رسی کی راہ میں نصیب ہوتی ہے!۔۔۔ سفاک قاتل کی گولی اس مشت خاک کے جسم پر نہیں چلی، عین انسانیت کے سینے کو چھلنی کر گئی!

گاندھی جی عقیدۃً بھی نیم مسلمان ضرور تھے، توحید کے پوری طرح قائل و معترف، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملک عرب ہی کا نہیں، ساری دنیا کا مصلح و معلم تسلیم کرنے والے، آپ کے نام اور کام دونوں کی نہایت عزت کرنے والے، قرآن مجید کو ترجموں کی مدد سے بار بار اور کثرت اور شوق سے پڑھنے والے اور اپنے عمل کے لحاظ سے تو اس وقت ـــــــــ ہندوستان کی زندہ آبادی میں ہندوستان کے ہم ۴ کروڑ مسلمانوں کے سب سے بڑے پشت پناہ! ان کی اس شہادت سے ہندوستان پر بحیثیت

ؒ صدق ۵ فروری ۱۹۴۸ء

مجموعی جو کچھ گزرے گی، تو وہ ہے ہی، خود مسلمانوں کی، یہ کہنا چاہیے کہ وہ کمر توڑ گئے! مسلمانوں
کو ان کی چھنی ہوئی اور لٹی ہوئی مسجدیں واپس دلا رہے تھے، ان کے اندر سے مورتیوں
کو وہ ہٹوا رہے تھے: مسلمانوں کی جان، ایمان اور عزت، مال سب کی حفاظت وہ اپنا
دھرم سمجھے ہوئے تھے۔ بے گھر مسلمانوں کو پھر سے وہ گھروں میں آباد کرا رہے تھے، ہزار ہا
لکھو کھا نیم جان مسلمانوں میں از سرِ نو جان وہی ڈال رہے تھے۔ جان انھیں مسلمانوں کی ہمدردی
میں اور مسلمانوں ہی کی جانیں بچاتے ہوئے انھوں نے دیدی، اپنے کو قربان کر دیا، کہ
مسلمان محفوظ رہیں!

آج جب وہ اپنے خون بہتے ہوئے جسم اور فاقہ سے زار و نزار بدن کے ساتھ اپنے
مالک و مولیٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے، تو عجب نہیں کہ فرشتوں نے بہ ادب بارگاہِ قدس
میں عرض کی ہو، کہ دل کے اندر کے عقائد کا حال تو حضور والا ہی جانیں اتنی شہادت ہم اور
ہمارے ساتھ ناسوت کے بے شمار بندے بھی دے رہے ہیں کہ اس وقت آپ کی توحید کے
پرستاروں اور آپ کے حبیبؐ کی امت کا سینہ سپر سب سے بڑھ چڑھ کر یہی بندہ تھا۔
اور جس جرم میں یہ قتل ہو کر آیا ہے، وہ بجز مسلم دوستی کے اور کچھ نہ تھا!

حسرت موہانی [1]

○

حسرت موہانی بھی آخر اللہ کو پیارے ہو گئے، اور یہ ایک سخت دھکا ہے جو اردو ادب اور
بیت اسلامی دونوں کو بیک وقت پہونچا ہے
وم اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے اور غزل گوئی کے تو کہنا چاہئے بادشاہ ہی تھے۔ شوخی
ساتھ متانت کا اتنا دلآویز امتزاج کمتر ہی کسی کے حصہ میں آیا ہے۔ اپنے رنگ میں فرد فرید تھے۔
م عاشقانہ تھا، شوخی تھی بے حیائی نہ تھی، رندی تھی اوباشی نہ تھی۔ معاملہ بندی تھی فحاشی نہ تھی
لفی تھی رکاکت نہ تھی۔ سنجیدگی تھی خشکی نہ تھی۔ ترکیبوں کی صناعت، بندشوں کی لطافت،
ب کی نزاکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ جدت کی اجنبیت نہ تھی، ندرت تھی، طرفگی تھی۔
ب نہ تھی مومن و نسیم دہلوی کے رنگ کو پھر اپنا یا پھر چلایا، چمکایا، عشق جگایا تو بہت عم کے

---

[1] صدق ۱۴ ستمبر ۱۹۵۱ء

کے ساتھ، اشراف، پردہ نشین خاتون کے ساتھ آشنائی کا دم رقیبوں کے غول در غول، بازاری بیسواؤں ک
ساتھ کبھی نہ بھرئیے کلام پڑھیے تو دل میں سوز و گداز پیدا ہوگا، ولولے پیدا ہوں گے تمنائیں انگڑائیاں
لیں گی. جذبات نفسانی میں ہیجان ایک بار پیدا نہ ہوگا۔

محاورات پر عبور زبان پہ حکمرانی بلکہ صاحبقرانی کر بایں وشاید شعر جتنا اچھا کہتے تھے
ہی اچھا پرکھتے بھی تھے. سخنگوئی اور شئے ہے اور سخن فہمی اور، یہاں جو پایہ سخنوری میں تھا
سخن سنجی میں!؟ یار آں دارد و ایں نیز ہم. اردوئے معلی کے پرچوں کو پڑھ پڑھ کر خدا معلوم کتنو
کو خود دعوئ نقادی ہوگیا. آخر زمانہ میں ادھر کئی سال سے سیاست شاعری پر غالب آگئی تھی
پھر بھی سالہا سال کی مشاقی و اُستادی پر کوئی پانی کیسے پھیر دے!

سیاست میں وہ خود اپنی ذات سے خود ایک انجمن، ایک ادارہ ایک پارٹی تھے
شروع میں اپنے کو منسوب تلک کے اسکول سے کرتے رہے اور اب ایک عرصہ سے اپنے کو کمیونس
کہنے لگے تھے لیکن حقیقۃً وہ مقلد کسی کے بھی نہ تھے. مجتہد اگر نہیں تو منفرد تو ضرور رہے۔ کا
میں جب تک رہے ساتھیوں سے لڑتے بھڑتے اور آزادی کامل کا علم بلند کئے رہے. تحریک
خلافت میں رہے تو اسی شیر دلی کے ساتھ اور مسلم لیگ میں جب کام کیا تو حد یہ ہے کہ قائد
جناح صاحب تک کی شخصیت سے بھی نہ دبے. مذہبی اتنے کہ کسی میٹنگ کسی جلسہ میں بھی ہ
ادھر نماز کا وقت آیا اور ادھر وہ اپنی میلی کچیلی ہی شیروانی اتارا اور اسی کو جا نماز بنا، کمرہ
برآمدہ میں جہاں بھی جگہ ملی نماز کے لئے کھڑے ہوگئے. حج زندگی میں ایک دو نہیں سولہ کئے م
سلسلہ قادریہ میں فرنگی محل کے خاندان رزاقیہ میں تھے اور خوش عقیدگی میں حد غلو تک پہ
ہوئے تھے۔

رُدولی بانسہ اور لکھنؤ کے عرس تو شاید ہی کبھی ناغہ ہونے پاتے اتنی گنجان دا
اور مذہب کے ساتھ یہ شیفتگی دنیا کے کسی کمیونسٹ میں پائی گئی ہے؟

سیاسی، ادبی اور سارے پبلک پہلوؤں سے بڑھ چڑھ کر دلکش، پُر تاثیر قابل عظ

مولانا کے ماہانہ رسالہ کا نام (مرتب)

تو وہ صفات، خود حسرت کی شخصیت اور ذات تھی۔ سادگی، بے تکلفی، تواضع، انکسار کی
تصویر تھے اپنی بڑائی کا احساس تک نہ تھا ان کی کمیونزم بھی درویشی کے مرادف تھی۔ گھر میں
وغیرہ کا ذخیرہ سال بھر کے لئے کیا معنی مہینہ بھر یا چند روز کے لئے بھی جمع کرنا ناجائز سمجھتے تھے
روز کا روز سودا اپنے ہاتھ سے لاتے تھے۔ جب دیکھئے دامن میں لئے بازار سے چلے آرہے ہیں۔
سی سے تکلف نہ کوئی شرم اور جھجک۔ راستے میں بڑے بڑے موڈرنسٹین مل گئے بے دھڑک
سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ میلی شیروانی میلی ٹوپی، بوسیدہ عینک کے ساتھ راجہ سلیم پور
ہاں چلے گئے، فلاں راجہ، فلاں نواب، فلاں گورنر کے ہاں چلے گئے اور جو کچھ کہنا تھا، لگی
ٹی رکھے بغیر کہہ سن آئے۔ کوئی مہمان آگیا تو کچھ پروا نہیں رات کی باسی کھچڑی چھینکے پر ٹنگی
وئی دہی لے کر خود بھی کھائی اس کو بھی کھلا دی بڑا تکلف کا اہتمام کیا تو جا کر دو پیسہ کا دہی
آئے۔ ہر حال میں مست .... اور مگن اتنے لیڈروں میں انھیں کو دیکھا بے صبری
رنا شکری کا لفظ جیسے ان کے کان میں کبھی پڑا ہی نہ تھا۔ جو کچھ بھی مل گیا ہنسی خوشی کھا
اور کچھ نہ ملا تو فاقہ بھی اسی خوشی دل اور بشاشت قلب کے ساتھ کاٹ دیا۔ نفسِ مطمئنہ
بوں میں پڑھا تھا کہ بعض بزرگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، آنکھوں سے مثال اسی درویش
زندگی میں دیکھی۔

آہ — ابوالکلامؒ!

آج وہ اٹھ گیا:-

۱. جو اُردو ادب و انشا میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا جس کا اس میدان میں کوئی ہمسر و شریک نہ تھا اور وہ جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

۲. جو اُردو زبان کا ایک بہترین مقرر و خطیب تھا۔

۳. جو مدتوں دین و قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت اور ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

۴. جو ملکی سیاسیات کی صف اوّل میں ۳۰، ۳۵ سال سے رہا کیا۔

۵. جس نے اردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

۶. جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی کہنا چاہیے اب آخری یادگار رہ گیا تھا

۷. جو اب ایک پیکر شرافت بن گیا تھا اور ۴۷ء کے بعد سے خدا معلوم کتنے۔۔۔

بے سہاروں کا سہارا بنا رہا۔!

اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔!

اللھم اغفرلہ وارحمہ

از صدق جدید ۲۸ فروری ۵۸ء

"جواہر لال نہرو"[۱]

۱۸۸۹ء تا ۱۹۶۴ء

پنڈت جی کے مذہبی عقیدوں سے یہاں بحث نہیں، ان کی لادینی آشکارا تھی۔ یہاں ذکر ان کی بلند کرداری اور شرافت نفس کا کرنا ہے۔ وہ ایک بڑے شریف و کریم باپ کے بڑے شریف و کریم فرزند تھے۔ تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ پائی۔ پرورش بڑی ہی خوشحالی اور انتہائی نازونعمت کے ماحول میں ہوئی۔ آزادیاں ہر قسم کی، کیا ہندوستان اور کیا انگلستان میں میسر رہیں۔ بے فکری سے جس طرح چاہتے خوب پیتے پلاتے یار آشناؤں کے ساتھ گلچھرے اڑاتے ہر طرح داد عیش دیتے۔ یہ کچھ ہوا، شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑی علمی بلندیوں کے بجائے ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع ہی سے اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا، اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا، نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی۔ نہ اپنے کو بڑا مانا، نہ کسی پر اپنا تفوق جتایا۔ خدمت لینے کی نہیں خدمت کرنے کی دھن سوار رہی۔ دنیا نے خادم کی جگہ انھیں مخدوم بنا دیا۔ اور اپنے سر اور آنکھوں پر جگہ دینا شروع کر دی۔ جوانی میں بڑی سختیاں جھیلیں، خدا معلوم جیل ہی میں کتنی مدت کاٹی۔ دوستوں کی بے وفائی، طوطا چشمی، غداری کے شکار آخر تک رہے، انھوں ہی کے تیر و نشتر کھاتے رہے۔ صحت جو آخر میں اتنی گر گئی تھی اس میں سن شیخوخت سے کہیں زیادہ دخل ان مسلسل دل شکنیوں اور شدید مایوسیوں کو تھا۔

❊ ~~~~~ ❊ ~~~~~ ❊

مسلمانوں نے ہمیشہ خوب ہی پوشاک کھانے پینے، بول چال، عام طرز معاشرت و تمدن

---

[۱] صدق جدید جون ۱۹۶۴ء

میں دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب تمدن کو بالکل اپنائے ہوئے تھے
اور اپنے والد پنڈت موتی لال کے قدم بہ قدم تھے۔ رفیقوں، دوستوں، مخلصوں میں بڑی
تعداد مسلمانوں کی تھی، مولانا محمد علی۔ مولانا ابو الکلام، ڈاکٹر سید محمود۔ حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر
انصاری عبدالمجید خواجہ۔ چودھری خلیق الزماں۔ تصدق احمد خاں شیروانی سے گہرے تعلقات تھے
اور رفیع احمد قدوائی تو جیسے اُن کے عزیز قریب ہی تھے۔ خدا جانے کتنے نوجوان مسلمانوں کو اپنے
خرچ سے پڑھوایا، ملازمتیں دلوائیں۔ روزگار سے لگایا اور کتنے سن رسیدہ مسلمانوں کو اپنے
پاس سے مالی امداد کی۔ جوانی کا کوئی بھی ساتھی اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد مل گیا تو اس کی آؤ بھگت
اُسی پرانے طریقہ پر کی یہ پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ وہ اس وقت وزیر اعظم ہند سے مل رہا ہے۔۔
غریبوں، ضعیفوں، مصیبت زدوں کی امداد میں ملکہ خاص حاصل تھا۔ غرض جوہر انسانیت
کا ایک نمونہ تھے اور ایک ہی وقت میں مدبر بھی مفکر بھی صاحب علم بھی پرانی اردو میں ایک لفظ
"وضعداری" آتا ہے وہ گویا ان پر ختم تھی۔ عام مسلمانوں کے لئے اب بھی ایک بڑا سہارا بنے
ہوئے تھے۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک ------ مزاج میں تواضع و فروتنی اتنی کہ ۱۹۲۴ء میں
جب میں نے مولانا محمد علی سے پوچھا کہ گاندھی جی کا جانشین آپ کے خیال میں کون ہو سکتا
ہے؟ تو انھوں نے جھٹ سے جواہر لال نہرو کا نام اور صرف انھیں کا لیا اور ساتھ ہی یہ کہا
کہ اُن میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے کو پیچھے ہی بہت رکھتے ہیں۔ مولانا ہی نے اپنے صدارت
کے زمانہ کانگریس ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا اور طریقوں سے
بھی آگے بڑھایا۔

ہندوستان کی ۴۶ کروڑ مخلوق کے تو گویا سیاہ و سپید کے مالک تھے ہی۔ برِ اعظم
ایشیا بلکہ کہنا چاہئے کہ روئے زمین پر اقتدار کے حصہ دار تھے۔ مرجع خلائق اور نامورانِ عالم
کے مرکز بنے تھے۔ جب وقت موعود آیا۔ تو آنے میں چند گھنٹے بھی مشکل ہی سے لگے۔ اِمی

کو صبح [illegible] پر اچانک بیماری کی پہلی علامتیں معلوم ہوئیں اور ماہرینِ فن ڈاکٹر ٹیلیفون پر [illegible] اور ہر ممکن انسانی تدبیرِ دوا علاج کی شروع ہو گئی کچھ ہی دیر بعد بیدار مغز اور مسیحہ ذہانت و فطانت مریض بیہوش تھا. ڈاکٹر پر ڈاکٹر جمع ہوتے گئے. مریض کی حالت بگڑتی چلی گئی. ۱۱½ پر حالت اور بگڑی. آکسیجن پہلے سے دیا جا رہا تھا. بلڈ پریشر گرنے لگا. اور ۱½ بجے نبضیں ڈوبنے لگیں اور ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ۔۔۔۔۔ اٹل تقدیر کے آگے عقل سائنس تدبیر کی متحدہ ترقی یافتہ کوششوں کی شکست کا ایک اور اعلان ہے. یہاں تک کہ دوپہر کے دو بجتے ہی مملکت ہند کا آفتاب اپنی ساری خیرہ کن تابانیوں کے ساتھ غروب ہو کر رہا۔ موت جس طرح دنیا کے حقیر ترین گدائے بے نوا کو آتی ہے اسی قطعیت اور اسی برق رفتاری سے وقت کی ایک مقتدر ترین ہستی کو آگئی! ماہرین فن کی پوری ٹیم ایک منٹ دو منٹ کے لئے ہوش ہی میں لے آنے میں ناکام رہی! ۔۔۔۔۔
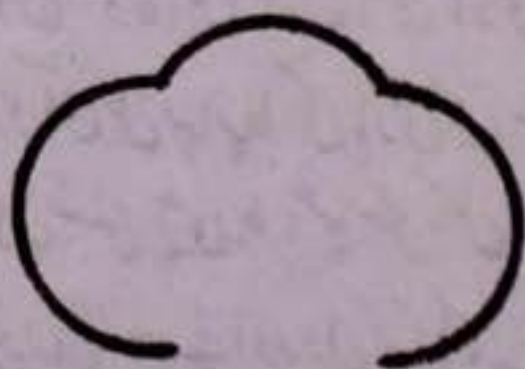
راجہ علی محمد خاںؒ

محمد علی کے بعد علی محمد! سنہ عیسوی کا آغاز تھا کہ ملت نے محمد علی کا داغ سینہ پر کھایا سنہ ہجری شروع ہوا تو علی محمد خاں نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ قوم کا خادم جب رخصت ہوا اور وطن کا مخدوم اب۔

آج وہ کل ہماری باری ہے!

آج "مہاراجہ" کی باری آئی کل "مہاپرجا" کی باری تھی۔ شب برات میں ایک کی طلبی ہوئی۔ محرم میں دوسرے کی سنائی سننی پڑی۔ غربا کا جگر "کل" پھٹ چکا تھا۔ امراء کا "آج" ٹوٹ کر رہا! کن کن حسرتوں پہ روئیے اور دل کو کیا کہہ کر سمجھائیے! خاص و عام امیر و غریب راجہ اور پرجا، سب کے سب اب حسرت و یاس کی تصویر، مجبوروں سے بڑھ کر مجبور اور یتیموں سے بڑھ کر یتیم الانسان ضعیف البنیان کائنات کے ذرہ ذرہ کی حرکت کو اپنی

صدق ۔ ۔ ۔ ۱۹۳۱ء

ـزنی کے تابع دیکھنے کا آرزومند، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی آج تک بھی پروا کی گئی ہے!
جس حکمت کاملہ نے، عالم کے سردو سرد ارکو مخاطب کرکے انک میت وانہم میتون کی منادی کردی
ـس کی مشیت کے آگے ظاہر ہے محمد علی کی ہستی اور علی محمد کی بساط ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جو
بھیجے گئے تھے وہ واپس بلا لئے گئے اور جس نے بھیجا تھا، وہ اسی آن اور اُسی شان، اسی
ـباہ اور اُسی جلال، اُسی تزک اور اُسی احتشام اسی دارائی اور اُسی کبریائی، اسی جمال
ـسی دلربائی، اُسی ناز اور اُسی محبوبی، اُسی حسن اور اسی زیبائی کے ساتھ، جوں کا توں،
ـم، حی و قیوم۔!

مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا، لا الٰہ الا اللہ!

کہتے ہیں، کہ راجہ ڈیرا نے نیازمندوں کی زبان بجائے لفظ "مہاراجہ" کے "راجہ" ہی کی
ـدی تھی، علی محمد خاں شیعہ تھے ہوں گے، زبانوں پر چرچا ہے کہ بڑے نیشنلسٹ تھے یہ بھی
ـیح ہو گا لیکن میں جن راجہ صاحب محمود آباد سے واقف تھا وہ مسلمان ہی تھے اور نرے
ـلمان اوّل بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان، محمد علی کی سی تڑپ اور تپش نہ سہی، پھر بھی زبان
ـحمد کا کلمہ دل میں اسلام کا درد اور دماغ میں مسلمانوں کی خیراندیشی دسترخوان کی وسعت
ـلمان کے استقبال کو موجود خزانہ کی تھیلیاں ہر کلمہ گو کے لئے کھلی ہوئی دولت کی تمنا
ـتو مسلمانوں پر زرپوشی کے لئے اعزاز کی طلب تھی تو مسلمانوں کی نفع رسانی کی غرض سے
ـفیض کا چشمہ تھا قوم کی سیرابی کے لئے ایک کرم کا دریا تھا افراد قوم کی آبیاری کو
ـجود و عطا کا بادل تھا جو اُمنڈ اُمنڈ کر برسا اور اس طرح برسا کہ اپنے رقبہ حدود
ـتشنہ لب نہ قوم کو چھوڑا، نہ افراد قوم کو! اس کا در حاجتمندوں کا مرجع، اس کی ڈیوڑھی
ـدوں کی اُمیدگاہ، کم نصیب تھا وہ جو اُس کے یہاں سے مایوس اور اُس کے

پاس سے محروم واپس ہوا۔

صوبہ کا ایک شریف سنی مسلمان حج کے لئے روانہ ہوتا ہے اور رخصتی ملاقات کے وقت اپنے لڑکے کا ہاتھ اسی شیعہ رئیس کے ہاتھ میں دے جاتا ہے حاجی کو حج مبرور نصیب ہوتا ہے اور استراحت دائمی کے لئے حرم پاک کی سرزمین یتیم لڑکا کالج میں زیر تعلیم ہے اور ختم تعلیم میں ایک سال کی مدت باقی۔ دریادل شیعہ رئیس کو اطلاع ہوتی ہے اور بارہ مہینے کے بجائے سولہ مہینے کے لئے پچاس روپیہ ماہوار کے حساب سے پورے آٹھ سو کی رقم بینک میں اس کے نام سے جمع ہو جاتی ہے ـــــ لکھنؤ کے ایک نہایت شریف و ممتاز سنی گھرانے کی ایک مسکین بیوہ کی جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے سامان غریبانہ حیثیت کا بھی میسر نہیں شیعہ رئیس کو خبر ہوتی ہے اور دوسری صبح ایک معتمد خاص کے ہاتھ ایک پورا سیکڑہ چپ چپاتے اسی بیوہ کے ہاتھ میں پہونچ جاتا ہے۔ یہ جس محمود آباد کے غم میں افسردہ و ملول ہوں وہ یہ تھا اس کی فیاضیوں کے بے شمار واقعات میں سے دو یہ صرف نمونہ کے طور پر یاد دلائے گئے۔ وہ قومی لیڈر اور نیشنلسٹ پارٹی کے افسر، مسلم لیگ کے صدر، ایک مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، لکھنؤ یونی ورسٹی کا ساعی اور اودھ چیف کورٹ کا بانی، انبلگر کا دوست اور رستن کا دشمن، آئی، ڈی، بی۔ کا مالک اور ہمدم کا پروپرائٹر حکومت کا ہوم ممبر اور سرکار برطانیہ کا منظور نظر نہیں، وہ ایک مسکین نواز، یتیم پرور، شریفوں کا سرپرست اور حاجتمندوں کا حاجت روا، اپنے وطنوں کا وارث، غریبوں کا دستگیر مہمان نواز، دریا چشم، درماندوں کا شفیع اور بیواؤں کا کفیل علی محمد خاں تھا اس کے بڑے بڑے شاہانہ چندے اور لکھو کھا لاکھ کی قومی فیاضیاں سب نے دیکھیں! اُس کی چھپی ہوئی خیرات اور پوشیدہ زرپاشیوں کی خبر مخلوق میں کس کو؟

دنیا اور اس کی جگمگاہٹ ختم ہو چکی۔ نیشنلزم اور کمیونلزم کے مناقشے تمام ہو چکے۔ بندہ اپنے
مالک کے پاس پہونچ چکا۔ راجہ پرجا بن کر حقیقی مہاراجہ اور اصلی شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہو
گیا۔ نوحے لکھے جا رہے ہیں، ریزولیوشن پاس ہو رہے ہیں، تقریروں میں قوتِ خطابت کے
کمالات دکھائے جا رہے ہیں اور شعراء نامدار مضمون آفرینیوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔
بہتر ہے دنیا کی ان طلسم آرائیوں کو چھوڑ کر آئیے ہم اور آپ مل کر سیکڑوں اور ہزاروں محتاجوں
اور دردمندوں یتیموں اور بیواؤں مسکینوں اور معذوروں کے ہم آہنگ ہو کر، مرنے والے
کے حق میں دعاء مغفرت اُس رب الارباب کے حضور میں پیش کریں جس نے اپنی رضا ناتوانوں
و کمزوروں بیکسوں اور دل شکستوں کی رضا میں مخفی کر رکھی ہے آج نہ راجگی باقی ہے نہ
مہاراجگی نہ ہٹلر کی دوستی کام آ رہی ہے نہ حکومت کی ہوم ممبری نہ کے سی۔ ایس۔ آئی۔ کا
خطاب پوچھا جا رہا ہے نہ انجمن تعلقداران اودھ کی صدارت، نہ کوئی مصاحب، رفیق ہے
نہ کوئی مشیر۔ ہاں! آج قدر ہو رہی ہے تو اُن بھوکوں کو کھانا کھلانے کی، جو دانہ دانہ کو ترس
رہے تھے اُن ننگوں کو کپڑے پہنانے کی جو ایک دھجی اور ایک ایک چیٹ کے لئے آسمان کا
منھ تک رہے تھے جو مخلوق کی نظر میں حقیر اور بے چارے تھے، وہ خالق کے دربار
میں رفعت والے نکلے، جنھیں کچہریوں کے پیادوں اور کوٹھیوں کے دربانوں نے دھکے دیکر
نکالا تھا! انھیں ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ملائکہ کی صفیں آگے بڑھیں جس نے دنیا میں
ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا، ان ٹھکرائے ہوئے سروں پر اپنا ہاتھ پھیرا تھا! اُس کی
بشری کمزوریوں اور لغزشوں کا شمار کچھ بھی نہیں، کیا اس مولا کے دربار میں جو کریم ہوگا
کریم اُس کے ساتھ بجز لطف و رحمت بجز عفو و مغفرت کے کسی اور معاملہ کی بھی توقع
ہو سکتی ہے؟ جا اے نیک دل رئیس اے اُمتِ مرحومہ کے غمخوار و غمگسار، اپنے رب اور
مولا کے حضور میں خوشی خوشی جا! خائف و متردد نہ ہو کہ آج تیری حمایت اور پشت پناہی
کو یتیموں کی فوج، بیواؤں کی قطاروں کی قطاریں اور بیکسوں کی صفیں کی صفیں ہیں!

رفیع احمد قدوائی مرحومؒ

آنریبل رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک مملکت ہند کی وفات پر تعزیت کی جائے کس سے
کی جائے؟ کون ہے جو دل سے ان کا سوگوار نہیں؛ کون ہے جس کی وہ بالواسطہ سہی کوئی
نہ کوئی خدمت نہیں کر گئے۔ ۱۸۹۴ء میں مسولی ضلع بارہ بنکی کی خاک سے اٹھے ۱۹۵۴ء
میں ناسوتی زندگی کے ۶۰ سال گزار کر اسی خاک میں چھپے۔ خدمت خلق کو بطور مقصد حیات
یا مشن کے اختیار کر کے ایک عالم میں اپنا نام کر گئے۔

قدوائی خاندان اودھ کا ایک مشہور خاندان ہے ہر علم و فن ہر شعبۂ زندگی میں آج سے
نہیں کئی صدیوں سے ممتاز۔ خود رفیع مرحوم کے حقیقی چچا جوان مرگ ولایت علی "بمبوق" (متوفی
۱۹۱۰ء) انگریزی کے ایک بہترین انشا پرداز اور مولانا محمد علیؒ کے مخلص خصوصی
حال ہی میں گزر چکے ہیں۔ رفیع مرحوم بعض حیثیتوں سے ان سب سے بازی لے گئے۔

علی گڑھ میں تعلیم پائی، تربیت خصوصاً سیاسی تربیت موتی لال نہرو کے سایۂ عاطفت
اور جواہر لال نہرو کی رفاقت میں ملی، نظم و تنظیم کی بے مثل صلاحیت فطری تھی۔ علی گڑھ
میں اس کی نشو و نما ہوئی در دولت علی گڑھ سے لیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ کے لئے آنند بھون
کے در و دیوار کافی تھے۔ اپنے کو پیچھے ہی رکھنا جانتے تھے۔ اپنے کو آگے بڑھانے کے فن
سے ناواقف تھے مگر بڑھائے گئے، کھینچ کر اور دھکیل کر آگے بڑھائے گئے کونسل کے ممبر ہوئے
پھر اپنے صوبہ میں پہلے ریونیو اور پھر ہوم منسٹر ہوئے لیکن ان کی ہوم منسٹری کے عدل و
قسط، دادرسی اور حق کوشی کو ہندوؤں کی متعصب پارٹی برداشت نہ کر سکی، ہٹائے گئے

صدق جدید ۱۴ نومبر ۱۹۵۴ء

بٹ کر اور او نچے ہوئے صوبائی وزیر کے بجائے حکومت ہند کے وزیر ہوئے محکمہ ڈاک و تار
لیا اور اس میں نام پیدا کر کے رہے پھر دشوار ترین محکمہ غذا میں منتقل ہو گئے سالہا سال کی
گرانی کو انھیں نے مٹایا راشن کو انھوں نے توڑا اور جس محکمہ کو سنبھالنے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد
جیرام داس دولت رام اور گورنر کے ایم منشی جیسے خواص تک سب عاجز و ناکام رہ چکے
تھے اس میں کامیابی نے قدم انھیں کے چومے اور جو بدنامی یقینی سمجھی جاتی تھی اس کے بدلے
نیک نامی کا تاج انھیں کے سر کو نصیب ہوا۔

کہتے کم تھے کرتے زیادہ تھے کتابوں کا مطالعہ برائے نام سا تھا مصداق فی الحقیقت
"خود تو ی ام الکتاب" کے تھے۔ اپنی فطری ذہانت، ہوشمندی، فہم سلیم کی مدد سے باتیں اپنے
دماغ سے نکالتے تھے تقلید جامد کے قائل نہ تھے۔ تقریر کے شوقین اور تقریر باز نہ تھے
ضرورت کے وقت تقریر کرتے وہ بھی مختصر اور حشو و زوائد اور خطابیات سے پاک سراپا عمل
تھے اور ہر وقت عملی سرگرمی میں منہمک اس کے باوجود خشک یا عبوس ذرا سا بھی نہ تھے ہر وقت
خوش رہتے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ بہت سویرے اٹھتے
اور اسی وقت سے ان کا کام کاج شروع ہو جاتا۔ دنوں کے کام گھنٹوں اور گھنٹوں کے
کام منٹوں میں چکا دیتے کھڑے ہو کر اور ٹہلتے ہوئے یا لیٹے ہوئے بہر حال و وضع میں کام ہی
کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ غالباً جانتے ہی نہ تھے کہ کوئی چیز بے شغلی بھی ہوتی ہے ہندو
سیاسی کارکنوں، مدبروں، اہل سیاست کے مقابلہ میں ان کے درمیان میں گھرے رہ کر اپنے
حسن عمل، قابلیت، حسن انتظام، کارگزاری، تدبر اور تدین سے مسلمانوں کا بول بالا کر دیا۔
تنہا یہی ایک خدمت قدوائی مرحوم کو امتیاز اور ..... بڑے امتیاز کے مقام پر کھڑا کر
دینے کو کافی ہے۔

دشمنوں سے اس طرح ملتے کہ جیسے دوستوں سے ملا جاتا ہے۔ دوستوں سے یوں
برتاؤ کرتے کہ جیسے عزیزوں قریبوں سے کیا جاتا ہے۔ اور عزیزوں اور قریبوں کو اپنے

نفس کی طرح عزیز رکھتے۔ بلکہ شاید اس سے بھی مقدم اور یہ دوست و دشمن اپنے اور غیر کی تو تمیز بھی کیسی ہ کوئی ان سے کام نکالنا چاہے یا کسی کو ان سے کوئی ضرورت آپڑے تو انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کون اپنا ہے اور بے گانہ کون۔ مقصود انھیں صرف کام کر دینا ہوتا تھا اور اس وقت ہر ایک ان کا "اپنا" ہوتا تھا بے گانہ کوئی بھی نہ رہتا ـــ خلق اللہ کی خدمت وہ عبادت کی طرح کرتے تھے اور خدمت کرنے میں انھیں وہی مزا آتا تھا جو دوسروں کو خدمت لینے میں آتا ہے!

جوانی آزادانہ گزری لیکن عمر کے کسی دور میں نشۂ و نوش کے قریب گئے نہ ان شغلوں میں پڑے جو لازمۂ شباب سمجھ لئے گئے۔ ترقی اخلاق و ادب کی پوری پابندی کے ساتھ شباب اور شیب کی ہر منزل گزار دی۔ شادی خاندان ہی میں ہوئی اور بیوی نیک دل دیندار عبادت گزار ملیں۔ نہ انھیں کبھی پردے سے باہر نکالا نہ انھیں کسی طرح آزاد شغلوں میں شریک کیا۔ بلکہ ان کی دینداری میں ہر طرح معین ہی رہے۔ پچھلے سال انھیں حج بھی کرا دیا ـــ جس اونچے حلقے میں وہ تھے وہاں اس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

زندگی تمام تر سادہ ہی رہی وہی موٹے کپڑے کی معمولی شیروانی اور پائجامہ، سوٹ، ہیٹ کو چھوا ہی نہیں۔ کپڑے کسی اونچے ٹیلر ماسٹر کی دوکان سے نہیں گھر میں سِل کر آتے۔ سرکاری کوٹھی اور فرنیچر جیسا بھی شاندار ہو ان کے گھر کو جا کر دیکھئے تو حیرت ہو جائے۔ ٹوٹا پھوٹا پرانی وضع کا مکان جو اتنے بڑے منسٹر کیا معنی ان کے کسی ماتحت اچھے عہدہ دار کے بھی شایانِ شان نہیں۔ وطن کے موقع پر جو ہزاروں اجنبی باہر سے مسولی پہونچے انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ کسی بڑے منسٹر کا مکان اتنا معمولی بھی ہو سکتا ہے! ـــ وضعداری کی ایک یادگار مثال یہ بھی ہے کہ عید بقر عید کی نماز پابندی سے اپنے وطن مسولی ہی میں آکر پڑھتے تھے۔

جس سے جس طرح ایک بار مل لئے بس عمر بھر اسی طرح ملے گئے۔ نخوت اور خود بینی کا عضو

ی ان کے دماغ سے غائب تھا۔ خلوت میں جلوت میں اندر باہر کہیں بھی ملتے یہ کہیں سے معلوم
نہ ہونے پاتا کہ ملاقات کسی وزیر مملکت سے ہو رہی ہے یو۔ پی میں زمینداری ٹوٹی بلکہ
ہیں کی تحریک پر ٹوٹی یہ بھی ایک چھوٹے زمیندار تھے اپنی زمینداری کو بچا لے جانا ان کے
ئے کیا مشکل تھا۔ مطلق کوئی تدبیر نہ کی اپنے عہدہ سے اپنی ذات کے لئے کسی ادنیٰ فائدہ
ٹھانے کا سبق انہوں نے پڑھا ہی تھا۔ سوتیلی والدہ زندہ ہیں خاندان کے ایک صاحب
ے روایت سننے میں آئی کہ ایک روز انھوں نے فرمایا رفیع زمینداری تو خوب ختم کردی،
ب گھر کا خرچ کیسے چلے گا خاندان بھوکا مرے گا سب کا انتظام کیا اپنے گھر کے لئے کچھ نہ
ی۔ رفیع مرحوم ہنس کر بولے (اور یہ ہنس کر بولنا ان کی عادت تھی) کہ اماں جان آپ گھبراتی
یوں ہیں زمینداری ختم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے میں کھرپا لے کر گھاس چھیلوں گا آپ بوجھ
ٹھا کر بیچئے گا۔ سب کی روٹی چل جائے گی ۔ یہ جواب دنیا دار انسانوں کے بس کا نہ
تھا ___ اس کے لئے اعتماد اولیاء اللہ کا سا ہونا چاہئے۔

مجھ سے دو ہی سال چھوٹے تھے اور مرتبہ کی بڑائی تو ظاہر ہی ہے لیکن ملتے تو اس
طرح کہ جیسے سن میں مرتبہ میں ہر حیثیت سے میں بہت چھوٹے ہیں اور کچھ میری ذات سے خصوصیت
بھی ہر ایک کے ساتھ یہی حال تھا۔ ماہوار ہزاروں کماتے اور ہزاروں اڑا دیتے خدا نخواستہ
ناچ رنگ کھیل تماشے شراب کباب میں نہیں عزیزوں کنبہ والوں کی تنخواہوں میں غریبوں
مفلسوں کی اعانت میں طالب علموں کی فیس میں اور ایسے ہر مد خیر میں، کوٹھی مستقل مہمان خانہ
بھی جسے دیکھئے ٹھہرا ہوا ہے دسترخوان کی وسعت کہنا چاہئے کہ کوئی حد ہی نہ رکھی آج
اس یتیم کی سرپرستی کر رہے کل اس نادار لڑکی کی شادی کرا رہے ہیں ابھی ایک طالب علم
ے حوالے ایک معقول چک کر ہی چکے تھے کہ دوسرے صاحب صورت سوال بنے ہوئے
ے بڑھ کر سامنے آگئے ایک دربار فیض تھا کہ مسلسل جاری تھا ___ ذاتی مکان اور
لباس کی بدحالی کا راز اب حل ہوا یا اب بھی راز ہی رہا؟

سیاسی مخالفین سے دوستی کا حق ادا کرتے رہنا بڑے جگر کا کام ہے کانگریس و لیگ
کے مناقشے کے زمانہ میں بڑے بڑے بڑوں کو اس امتحان میں بُری طرح فیل ہوتے دیکھا اور اب
اس ٹھنڈے زمانہ میں بھی ذرا کسی "نیشنلسٹ" صاحب کے سامنے لیگ یا پاکستان کا نام
لے کر تو دیکھئے یہ ظرف اللہ نے مرحوم قدوائی ہی کو دیا تھا کہ اپنی نیشنلزم پر پورے سو
فیصدی قائم و ثابت قدم رہ کر اسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھ کر بدگوئی نہ پاکستان کی کرتے نہ لیگیوں
کو برا بھلا کہنے کے لئے وقت نکال پاتے — اپنے اسلام پر منفعل و محجوب سے نہ تھے ان
کے سامنے کسی کی مجال نہ تھی کہ اسلام پر مضحکہ تو خیر الگ رہا مسلمانوں پر بھی طنز و طعن کر سکتا
اگست و ستمبر ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز زمانہ میں جب دہلی کے زمین و آسمان خون مسلم کے پیاسے
نظر آتے تھے انھوں نے خدا معلوم کتنوں کی جانیں بچائیں اور کتنوں کے پاکستان پہنچ جانے کا
انتظام کیا۔

بڑے اور صاحب اقتدار شخص کے دشمن سیکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں۔ رفیع مرحوم
نے اپنی سلامت روی اور شرافت نفسی کے طفیل اپنا دشمن شاید ہی کوئی چھوڑا ہو،
سیکڑوں یتیم آج انھیں رو رہے ہیں، صدہا بیوائیں ان کا سوگ منا رہی ہیں اور ہزارہا انسانوں
کو آج دل سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا دنیوی سہارا پاش پاش ہو گیا اور وہ
ایک جنگل میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں! اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور بلند سے بلند
مرتبے عطا فرمائے۔

"خوش نصیب گول کیپر"

تاریخ اور مہینہ تو بھلا اب کسے یاد، سنہ غالباً ۱۹۰۸ءھ تھا اور رچارڈسن کا زمانہ، علی گڑھ
کی فٹ بال ٹیم، لکھنؤ میچ کھیلنے کو آئی۔ ادھر علی گڑھ کے کھلاڑی گیند بلّے کے کرتب میں اپنا سکہ
مائے ہوئے، ادھر لکھنؤ کی خلقت کھیل تماشے کے شوق میں نام چمکائے ہوئے، شہر میں ایک دھوم
چ گئی، میچ پرانی کیننگ کالج گراؤنڈ پر تھا۔ قیصر باغ کے مشرقی و شمالی سرے پر تماشائیوں کے
ٹھ کے ٹھٹ لگ گئے، امیر، غریب، جوان، بوڑھے، طالب علم، سودے والے سبھی اور اسی
ہجوم میں ان سطور کا راقم ایک اسکول کا گمنام طالب علم بھی۔ علی گڑھ کے کھلنڈرے ایک سے بڑھ
کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڑھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک سرخ و سفید قوی و
تنومند، خوش رو نوجوان پہاڑ کی طرح اٹل اور چٹان کی طرح مضبوط، معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری
ے فرائض کے لئے ہی خلق ہوا ہے۔ لکھنؤ کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر کیسے کیسے
کرتی اور ہر حملہ بس گول کیپر کے تصدق میں ناکام! بس یوں سمجھئے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی
سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں! یہ تھا علی گڑھ
کالج کا ہونہار نوجوان اور شیروانی خاندان کا چشم و چراغ "تصدق" کون کہہ سکتا تھا کہ اسے چند ہی
روز بعد کھیل کود میں نہیں، فٹ بال فیلڈ کے سو پچاس گز کے محدود رقبے کے اندر نہیں، سیاسیات و
یات کی سنجیدہ اور خشک دنیا میں ہندوستان بھر کے طول و عرض رقبہ میں بڑی بڑی، زبردست
وں کا مقابلہ میں ملک و ملت کی گول کیپری کے فرائض انجام دینے ہوں گے!

سب سے پہلی زیارت یوں ہوئی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ سننے میں آیا کہ یہ کھیل کا مردِ میدان

ھ سنہ ۱۹۱۵ء

یونین کا وائس پریسیڈنٹ ہے اور اچھا جید مقرر بھی. یونین کے وائس پریسیڈنٹ کے مرتبہ کو
سمجھ سکتے ہیں جو علی گڑھ سے واقف ہیں' دل خوش ہو گیا کہ جو جسم کا دھنی تھا ہی اس کا
بھی کورا نہ نکلا! — چار پانچ برس کی درمیانی مدت چھوڑ جائیے — اب ۱۹۱۲
آتا ہے اور اس کے دسمبر کا آخری عشرہ لکھنؤ کی سرزمین رعشہ میں ہے اور پرانے قومی لیڈر
کے قلوب لرزہ میں! ایجوکیشنل کانفرنس' مسلم لیگ' مسلم یونیورسٹی' فاؤنڈیشن کمیٹی' ہر قومی
ادارہ میں' کامریڈ' ہمدرد اور الہلال کی معجزانہ تحریروں کے اثرات رونما ہو رہے ہیں. آزادی کی
کا بگل بج چکا ہے. "وفاداریٔ حکومت" اور "مطالبۂ حقوق" کے درمیان پوری شد و مد کے ساتھ
بازطاقت آزمائی ہو رہی ہے. ایک طرف سب کے سب پرانے لیڈر ہیں' یعنی وہ آقا جن کی
اس وقت تک قانون کا حکم رکھتی ہیں اور دوسری طرف باغی' ابوالکلام در شوریدہ سر محمد علی
مع اپنے چند نوعمر رفیقوں کے. ان گنے چنے رفیقوں میں آپ کو باعتبار ظاہر جو سب سے زیادہ
نظر آ رہا ہے (اور بلحاظ باطن بھی وہ کس سے کم ہے؟) وہ وہی پرانا گول کیپر ہے. تصدق احمد خاں
شروانی علی گڑھ کا گریجویٹ اور لندن سے لوٹا ہوا تازہ وارد بیرسٹر

⁂

آج سے محمد علی جو تحریک اٹھاتے ہیں' چاہے وہ کالج اور یونیورسٹی کی اصلاح کی ہو
جنگ بلقان کے چندے کی یا قوم و ملت کی آزادی کی' تصدق شروانی سب میں سب سے پیش
شیر دل جنرل کا ایک شیر دل لفٹیننٹ. یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء کی وہ ہنگامہ خیز تحریک خلافت
ترک موالات شروع ہوئی جس نے سارے ملک کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا ڈالا.
تصدق اس وقت ایک کامیاب بیرسٹر ہو چکے تھے' اب اپنے پیشے میں نامور' گھر کے خوش
پہلے ہی تھے اب تو خاصی عیش کی رئیسانہ زندگی بسر کر رہے تھے. قوم کے سرداروں کا حکم
کہ پریکٹس چھوڑ دو' بڑھتی ہوئی آمدنی سے موالات ترک کرو جو سر اس حکم کے آگے سب
پہلے جھکے ان السابقون الاولون میں ایک یہ بھی تھے. غالباً ۱۹۲۲ء تھا کہ علی گڑھ

ـدالت کے سامنے ایک بڑا ہجوم ہوا۔ شیروانی ہنگامہ فرو کرنے گئے۔ پولیس اور مقامی حکام کو
ـول کے بخار نکالنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ دھر پکڑے گئے۔ الٹا الزام اشتعال انگیزی کا لگا:
ـے تھے آگ بجھانے، مجرم آگ لگانے کے قرار پائے اور وہ جس کا کام قصورواروں کا چھڑانا
ـقا اور خطاکاروں کو رہائی دلانا تھا، اب خود مجرم و بے خطا قید فرنگ میں اسیر و
ـبوس تھا! ——— قید اور پھر قید سخت! غالباً کچھ روز کے لئے قید تنہائی بھی! اس
ـیس اور رئیس زادے کو بھلا اس سے مناسبت ہی کیا تھی؟ بڑی بڑی تکلیفوں کو
ـوڑ دیئے۔ تنگ و تاریک کوٹھری میں پچھ دن ہی نے ایسا جھنجھوڑ ڈالا کہ بے حال ہو گئے اور
ـربن کر نکلے۔ ماں باپ نے نام تصدق رکھا تھا۔ کیا یہ نام نام ہی رہتا؟ اور عزت کی!
ـرام کی! مال کی! جان کی قربانی کچھ بھی نہ طلب کی جاتی؟

٭ ٭ ٭

چھوٹے اور پھر پکڑے گئے، آزاد ہوئے اور پھر جکڑے گئے، وہ زندگی ہی کتنی تھی
ـے کر آئے تھے لیکن بہر حال جو کچھ بھی لکھا کر لائے تھے بس سب اسی الٹ پھیر میں
ـزار دی! ابھی دیکھئے تو علی گڑھ کی عدالتوں میں ہیں۔ الہ آباد میں صوبے کی عدالت العالیہ
ـنامور ایڈوکیٹ ہیں اور دوسروں کی بگڑی بنا رہے ہیں۔ موتی لال کے مشیر اور جواہر
ـل کے شریک و رفیق ہیں۔ کانگریس کو اپنے اشارات پر چلا رہے ہیں اور ابھی معلوم
ـا کہ لق و دق کوٹھی، سجی سجائی موٹر، نفیس مسہری اور دلکشا پائیں باغ، سب چھوڑ
ـڑ چوروں اور اٹھائی گیروں کی سی میلی کچیلی جانگھیا پہنے کھڑے ہوئے لعب زلوں
ـگرہ کٹوں کی قطاروں میں پھٹی گدڑی اوڑھے لپیٹے، جیل کی کھُری زمین پر پڑے ہوئے
ـں بلند ہو اقبال۔ سرکار نامدار کا، جوہر شناسی اسے کہتے ہیں، قدردانی اس کا نام ہے،
ـدوستان کی سرزمین کو کبھی کیوں ایسی خوش مذاق نکتہ نواز، قدرشناس حکومت
ـواسطہ پڑا ہوگا! ———

مرنے والا مر چکا۔ جینے والے اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے؟ ماں باپ نے تعلیم میں ہزار ہا روپے بے دریغ اسی دن کے واسطے اٹھائے تھے؟ کالج میں یہی ارمان دل میں تھے۔ ولایت اسی کی خاطر گئے تھے؟ بچپن کے ساتھیوں اور نوجوانی کے دوستوں میں آج کوئی جج تھا، کوئی ہائی کورٹ کا جج، کوئی ہزاروں کما رہا تھا، کوئی ہزاروں لٹا رہا تھا، کوئی صوبے کا منسٹر، کوئی اگزیکیٹیو کونسلر، کیا اس غریب کی قسمت میں یہی دن کاٹنے تھے اور یونہی ساری عمر بسر کر دینی تھی؟ اس کے پہلو میں دل کی جگہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا؟ اُس کے دل میں اُمنگیں باقی نہیں رہی تھیں؟ کیا وہ بھی کوئی ہندو سنیاسی یا مسیحی راہب بن چکا تھا؟ کیا اس کے بیوی بچے دوست عزیز بھائی مبدّ نہ تھے۔ کیا ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے سہنے، دنیا کا چین کرنے، زندگی کے سُکھ اٹھانے کی آرزوئیں دل میں مردہ ہو چکی تھیں؟ کیا اس کے بشری جذبات کا سرچشمہ خشک ہو چکا تھا؟ کیا تکلیف اسکے لئے تکلیف اور راحت اس کے لئے راحت رہ ہی نہیں گئی تھی؟ ہو سکے تو سوچنے والے سوچیں۔

محمد علی جیل جا کر شاعر ہو جاتے تھے ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۳ء کی قید سے جب نکلے تو غزلوں کا ایک پشتارہ ساتھ لئے ہوئے۔ شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی شاعری میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتے جیل خانے سے قبل مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں علی گڑھ کے شیروانی خاندان کے بعض اکابر سے بہت رنج اٹھا چکے تھے۔ رہائی کے بعد پہلی ملاقات ہوئی تو خوب اشعار سننے میں آئے۔ ایک بڑی سی غزل اس زمین میں سنائی "بیابانوں میں ہم" "پریشانوں میں ہم" اس میں ایک مشہور وفادار علی گڑھی بزرگ کی زبان سے فرمایا گیا تھا ؎

شرطِ وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی گدّی کے ساتھ جا ملیں یونانیوں میں ہم

(ایک اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے مسلمانوں کے "مجوزہ جیش انگورہ" کے مقابلہ میں جیش یونان کی تحریک کی تھی۔ یہ اشارہ اسی طرف تھا) اور تو اور اپنے بڑے بھیا تک کو نہیں چھوڑا تھا ؎

شوکت یہ کہتے ہیں وہ تن توش جب نہیں
پھر کیوں گھٹیں نہ اپنے کو رو حانیوں میں ہم

اخبر آئی تھی کہ مولانا شوکت علی راجکوٹ جیل میں رہ کر بہت لاغر ہوگئے ہیں یہ تلمیح اسی کی ہوئی۔ سناتے سناتے ارشاد ہوا کہ مزے کا شعر "تصدق" کی زبان سے کہا ہے اسے ضرور سنو ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
مانتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

شرافت کے امتحان کا اصلی وقت اختلاف و مخالفت کے موقع پر آتا ہے یوں تو جب تک دوستی دیکھا ہے، سبھی اچھے نظر آتے ہیں۔ محمد علی سے شروانی کا سیاسی اختلاف ۱۹۲۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ ادھر آغاز ۲۸ء میں مولانا کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہوگئی کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ صبح کی شام اور شام کی صبح کیونکر ہوگی مولانا کی لاعلمی میں دو چار نیاز مندوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ مخصوص مخلصوں سے کچھ ماہوار رقمیں جمع کر لی جایا کریں۔ نام پیش ہوئے محبت و عقیدت کے دم بھرنے والے بعض اچھے اچھے بزرگوار اس امتحان میں نکل گئے۔ شروانی کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر سید محمود نے ان کا نام بھی رکھا تھا۔ میں ذکر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ الہ آباد میں ایک بار جی کڑا کر کے تذکرہ کیا تو مرحوم نے اس فراخدلی اور خندہ جبینی کے ساتھ لبیک کہا کہ مسرت کے ساتھ حیرت ہو کر رہ گئی۔ یہ معلوم ہی نہیں

ہوتا تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کا ذکر کر رہے ہیں، بہر حال وہ تجویز تو عمل میں کبھی بھی نہ آسکی۔ زیادہ تر مولانا ہی کے انکار و استغفار کی بنا پر، لیکن شیروانی کی اس شرافت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اللہ مغفرت فرمائے اور درجات بلند سے بلند تر کرے، خوبیاں بہت تھیں، اس محبت و اخلاص اس ہمت مردانگی اس رواداری و فراخدلی، اس ذوق خدمت و تحمل مصائب کی مثالیں کم تر دیکھنے میں آتی ہیں، جمعہ کے دن کی موت، عین فجر کے وقت، ہر ایک نصیب میں آتی بھی تو نہیں ہے۔ اور پھر ہزارہا مسلمانوں کی دعائیں۔ خوش نصیب گول کیپر دنیا اور آخرت دونوں جگہ بازی لے گیا۔!

عبدالمجید خواجہ مرحومؒ

زندگی اور زندہ دلی کے پیکر مجسم "خواجہ" کو آج کس دل سے "مرحوم" لکھا جائے! لیکن دل چاہے یا نہ چاہے بہر حال قضا ہی ہے اور اس کے سر جھکانے کو ہم آپ کیا معنی ہر جن و بشر پیدا ہی ہوا ہے! ——— علی گڑھ کی خبر ۲۴ر دسمبر (دوشنبہ) کی ہے کہ آج گیارہ بجے دن کو۔ عبدالمجید خواجہ ۸۷، سال کی عمر میں اپنے وطن حقیقی کو سدھار گئے! آہ غفلت کی گھڑیاں اور ہم نادانوں کی مدہوشیاں! وہ جس کا نوجوانی کا چہرہ نازپروردہ اور چمکتا دمکتا ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتا ہے۔ آج اس سن کو پہونچ گیا تھا!

"خواجہ" ذات یا برادری کا نام نہیں ان کا گھریلو عرف تھا اور یہ اتنا چلا کہ ان کے نام کا جز بن گیا۔ ہم نیازمندوں کی زبان پر صرف خواجہ تھا۔ پورا نام صرف ضابطہ ہی کے موقعوں پر لیا جاتا۔

منقول صدق جدید ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء

علی گڑھ سے اخلاص ترکہ میں پایا تھا ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں سے تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدائے تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔

علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے کیمبرج سے بی اے کیا۔ لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے واپسی پر بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں آخر میں کئی سال سے پھر علی گڑھ آ گئے تھے اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ آخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک، صحت سخت خراب رہنے کے باوجود، بڑھ ہی گیا تھا۔

اللہ نے حسنِ ظاہری سے مالا مال کیا تھا۔ ولایت کی آزادیاں اس پر مستزاد۔ خواجہ کڑے امتحان میں پورے اترے، لندن جس طرح پاک صاف گئے تھے اسی طرح پاک دامان واپس آئے۔ یہ مجاہدہ نہ تھا تو اور کیا کہ شراب نوشی وغیرہ کا کوئی چھینٹا تک اڑ کر نہیں لگنے پایا تھا۔

اللہ نے پیسہ بھی دیا تھا۔ خواجہ پیسے کا صحیح استعمال جانتے تھے۔ مسرف ہوئے بغیر بڑے مہمان نواز تھے، مکان خصوصاً مہمانوں سے بھرا ہوا بلکہ قومی اجتماعوں کے موقعوں پر تو یہ معلوم ہونے لگتا تھا کہ مکان کوئی مستقل مہمان سرا یا ہوٹل ہے! پرتکلف خاطر داریاں، دعوتیں، پارٹیاں مع سارے لوازم کے۔

مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ کی لیڈری اسی سے شروع ہوئی تو یو پی کے دو گروپ خاص طور پر اس شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے ایک حلقہ میں یہی علی گڑھ کے مجید خواجہ ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن (اب نواب ناظر یار جنگ حیدرآبادی) تھے اور دوسرا حلقہ چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی مرحوم، عبدالرحمن صدیقی مرحوم۔ اور

عبدالعزیز انصاری کا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود کو یکساں عقیدت مولانا ابوالکلام سے بھی تھی، واقعہ
مسجد کانپور میں مسلم یونی ورسٹی کی تحریک میں ہلالِ ابس کے چندے میں جنگ بلقان کے چندے میں
اور آخر میں تحریکِ خلافت میں، تحریک جامعہ ملیہ ترک موالات میں مسلم لیگ میں، خواجہ بڑی
سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ اور ان کی شرکت، ہمدردی ہمیشہ "باغیوں" ہی کے ساتھ رہا کی۔

مولانا محمد علی سے اختلاف آخیر ۲۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا مسئلہ داخلہ کونسل
کے سلسلے میں خواجہ، پنڈت موتی لال نہرو، سی. آر. داس وغیرہ کے ساتھ داخلہ کونسل کے حق میں
ہو گئے۔ مولانا محمد علی، گاندھی جی، راج گوپال آچاریہ وغیرہ کے ساتھ بدستور نوچینجیر تھے یعنی
داخلہ کونسل کے مخالف پھر آخیر ۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ کے سلسلے میں مسلمان آزادی خواہوں
کے درمیان شدید تفریق کی بنیاد پڑی تو خواجہ صاحب کا اختلاف مولانا محمد علی سے اور
مسلم لیگ سے اور زیادہ گہرا ——— اور نمایاں ہو گیا اور یہ آخر دم تک
برقرار رہا۔

جب مسلم لیگ اور کانگریس کے دو بالکل مختلف کیمپ قائم ہو گئے اور رنجشیں تلخ سے
تلخ تر ہو گئیں تو خواجہ نے مسلم لیگ کے توڑ پر ایک آل انڈیا مسلم مجلس قائم کی اور خود اس کے صدر
منتخب ہو گئے گو یہ مجلس بھی کچھ زیادہ نہ بن سکی۔

مدتوں جامعہ ملیہ میں بہ حیثیت شیخ الجامعہ (پرنسپل) کا کام کیا اور اس کے امیر (چانسلر)
تو دم آخر تک رہے۔ وہ زمانہ قناعت سادگی اور جفاکشی کے دور دورہ کا تھا۔ خواجہ نے بھی
اس مہم میں حصہ لیا اور سفر انٹر کلاس میں کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ آنکھیں دولت و ثروت میں
کھلی تھیں۔ شعر و سخن کا یہی نہیں کہ اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور شعر کے خوب پرکھنے والے تھے بلکہ
خود شاعر بھی تھے اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی طرح تخلص شیدا رکھے ہوئے

علمی مذاق عجب جامع پایا تھا۔ باضابطہ عالم دین نہ تھے۔ لیکن علوم دینیہ میں مہارت اچھی
خاصی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام کسی موضوع میں بند نہ تھے اور بعض فرقوں سے تو مناظرہ میں

تو کہنا چاہیے کہ مہارت کامل رکھتے تھے۔ مسلکاً تو اہل حدیث تھے لیکن حنفیوں سے ایسے شیر و شکر رہتے تھے کہ کبھی ان پر گمان بھی غیر حنفی ہونے کا نہیں ہوتا تھا۔

حسرت موہانی مرحوم کی طرح خواجہ بھی اکثر معاملات میں و مسائل میں اپنی رائے ایک منفرد رکھتے تھے اور اس کا اظہار بڑی صفائی اور بے باکی سے بڑے چھوٹوں سب کی محفل میں کر ڈالتے تھے۔ اور کمیٹیوں میں شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہوتی ہو جس میں خواجہ اپنی ترمیم (امنڈمینٹ) پیش کرنے نہ کھڑے ہو جاتے ہوں۔ اس سے بالکل بے نیاز کہ کوئی ایک آواز ان کی موافقت میں اٹھتی ہے یا نہیں ۔۔۔ البتہ چونکہ کھرے نہیں بلکہ شیریں زبان تھے اسی لئے مخالف بھی بگڑتے اور چڑھتے ذرا کم ہی تھے۔ آنکھ اور زبان کی موہنی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔

فرقہ امامیہ کے عقائد سے سخت بیزار تھے اور اپنے خیال کی تائید میں گھنٹوں مدلل گفتگو کر سکتے تھے اس کے باوجود اس فرقے کے افراد سے خوب میل جول رکھتے تھے۔ چنانچہ آخیر عمر میں اپنی جائیداد کے مقدمات وغیرہ جن وکیل صاحب کے سپرد کر رکھے تھے ان کا تعلق اسی فرقہ سے تھا۔

حکایات لطائف و ظرائف کے بادشاہ تھے گھنٹوں پاس بیٹھ کر باتیں سُنئے تو طبیعت نہ اکتانے پائے۔

جنرل سکریٹری یو۔پی۔ کانگرس ۔۔۔۔ ایک عرصہ تک اور یو۔پی اسمبلی کے ممبر غالباً ۸ سال تک، رہے اگر چاہتے اور مزاج کو ذرا درباداری کے لائق بنا لیتے تو موجودہ سرکار میں بڑے بڑے عہدے آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔

ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ سے تھے۔ داڑھی بھی جوانی ہی کے زمانے سے رکھ لی تھی جواب بڑی ہو کر خوب سفید اور پُر نور ہو گئی تھی۔ گھٹنوں کے درد ضعف سے نماز کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر یا جس طرح بھی بن پڑتا آخیر تک ادا کئے گئے ۔۔۔ غیرت ایمانی اور جوش اسلامی آزادی ہند کے بعد سے بہت بڑھ گیا تھا مسلم یونیورسٹی

کے حال زار پر ہر وقت کڑھا کرتے اور اصلاح حال کی ہر عملی تدبیر میں لگے رہتے۔ یونیورسٹی کے نام سے جب "مسلم" حذف کر دینے کی تجویزیں ان کے کان میں پڑیں تو فرط غیرت سے تڑپ گئے اور بول اٹھے کہ میری زندگی بھر تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ مشیت الہیٰ نے انھیں عین ایسے وقت اٹھا لیا جب یونیورسٹی کو ان کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ اللہ مغفرت بالِ بال فرمائے۔

قائد ملتؒ

○

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت اگر آج ابھی کل ہی آگئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے؟ نام کئی ایک ذہن میں آئے۔ لیکن سب سے پہلا نام ذہن میں آیا وہ اسی مجاہد اسلام بہادر خاں حیدرآبادی کا تھا۔۔۔ کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے پھرتے پھراتے عین اس وقت اتفاق سے آموجود ہوتے! ایسا کیوں ہونے لگا۔ لیکن دل کی کشش سے ایسا ہو جانا کچھ ناممکن بھی نہیں! — یہ تھی اس نامۂ سیاہ کے دل میں اس شیر دل مجاہد ملت کی محبت، عظمت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جا رہی تھیں، کسے وہم گزر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا!

صدق جدید جولائی ۱۹۴۴ء

اور جس کی دعاؤں کے لئے یہ طلب و تمنا بھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہو جائے گا!...... آہ مشتِ خاک انسان اور اس کے تارِ عنکبوت جیسے بودے، پھسپھسے، کمزور ارادے، حوصلے، سہارے!

۴۰ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی! اور پھر کیسے تندرست و توانا، ہنس مکھ اور خوش مزاج، خوش سیرت، خوش صورت، بلا کے ذہین و نکتہ رس، کسی بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول، چمن بھر کو مہکاتا ہوا بات کی بات میں نذرِ خزاں ہو جائے گا؟ محفل بھر کو منور رکھنے والی شمع اسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے!؟ — کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی نہ سکرات نہ تکلیفیں نہ نزعِ روح کی سختیاں اور کیوں ہوتیں جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا، اس کی روح پکارنے پر معاً لبیک آخر کیوں نہ کہتی؟ تاخیر و تامل کی وجہ ایک منٹ کے لئے بھی آخر اُسے کہاں ہو سکتی تھی۔؟ —— رہبر دکن والے رہبرِ ملت[1] کی دو سال تک کی فوری موت کا راز بھی اب کچھ کچھ سمجھ میں آیا، جو دنیا میں نقیب تھا اس سے آخرت میں بھی نقیب ہی کا کام لیا گیا اور عجب کیا جو دنیا میں خدمتِ ملت کے دیوانے اور فلاحِ اُمت کی خاطر ایک دوسرے کے دست بازو، رفیق، ہمراز و دمساز تھے، انھیں جنت میں بھی ان کی خواہش پر یہی منتظلہ تفریح دیدیا گیا ہو! جو یہاں محمد کے دین کا سودائی تھا عجب تھا کہ جنت کی ہواؤں نے اس کو تیز سے تیز تر کیا ہو!

حیدرآباد کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ جس نے آج سے ۲۰-۲۲ سال پہلے کیا ہے۔ وہ آج ان حیدرآبادیوں کو پہچان بھی نہیں سکتا۔ اتنے دنوں میں اس کی کایا پلٹ کس نے کر دی؟ جو قوم سرتاسر بے عمل، بھبول، افسردہ منتشر اور پست مذاق اور بدنظمی کا شکار تھی، اس میں عمل تنظیم انضباط کی برقی رَو کس نے دوڑائی؟ یہ مُردوں کو زندہ کر دینے والی مسیحائی کس نے کر دکھائی؟ حیدرآبادی مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں کے سامنے شرم سے نہیں فخر سے پیش ہو سکے، یہ قلبِ ماہیت کس نے کر دی؟ اور جو دکن اجتماعی اور ملی زندگی میں سبق لینے کے قابل

---

[1] مولوی احمد محی الدین مرحوم ایڈیٹر رہبر دکن (حیدرآباد)

بھی مشکل سے تھا اسے سبق دینے کے قابل کس نے بنا دیا. سارا کارنامہ قلم لکھے چلا تھا کہ اعجازی کارنامہ اسی مرنے والے زندہ جاوید بہادر خاں اور اسی کے چند مخلص رفیقوں ہی کے اعمال نامول میں لکھا جائے گا ——— "قائدملت" جب کسی نے اسے کہا اس نے کوئی شاعری نہیں کی ادبی صنعت گری لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا ایک حقیقت بیان کر دی. تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اکل کھری. "قائدملت" راقم آج یہ لفظ پہلی بار صدق استعمال کر رہا ہے، کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علیؒ کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا. ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ وہی نبض شناسی وہی ہمت و عزم، غرض بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے اور سب کچھ وہی ——— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آئی تو سنا "اس لئے کہ شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو بڑا یہی اطمینان رہتا تھا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاءاللہ ہر غلطی کی اصلاح کرا کے رہے گی.

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علی گڑھ یونی ورسٹی کی مجلس تاریخ و تمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب دونوں کا بیان ہونے والا تھا. نواب سحر بیان کی خطابت بچہ بچہ سے خراج تحسین حاصل کئے ہوئے، اہل جلسہ نے غلطی اور شدید غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ ہی رکھ دیا. وسیع اور لق و دق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک کھچا کھچ بھرا ہوا. سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اس نے جواب دیدیا. اب بھلا میری آواز کیا پہونچتی. ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے کچھ سنائی نہیں دیتا اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں. میں تو پہلے ہی بیٹھنے پر آمادہ تھا فوراً صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا. معاً نواب صاحب کھڑے ہو گئے اور گرج کر بولے کوئی سُنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے لکچر کو اول سے آخر تک سنوں گا. میں تو انہیں کا لکچر سُننے آیا ہوں اور جب تک وہ اپنا لکچر

تم نہ کرلیں گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کرونگا"

مجمع میں سناٹا چھاگیا تھا! ——— ہے کہیں اس دور میں اس شرافت کی مثال — ؟

۶ اپریل ۱۹۴۲ء لکھنؤ میں نواب صاحب یوم اقبال کی صدارت کرکے ندوہ میں ڈالی باغ میں گنگا پرشاد میموریل ہال میں متعدد جلسوں میں معرکہ کی تقریریں کرکے صبح کی گاڑی سے دہلی حیدرآباد واپس جارہے ہیں میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہونچا ہوں خیال یہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی۔ موٹر اسٹارٹ ہوتا ہے ادھر نواب صاحب زبان دعاؤں پر کھلتی ہے۔ سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی، ابھی ختم ہوئی جاتی ہے لیکن یا، کہاں ابھی ختم ہوئی، دو سکنڈ، چار سکنڈ، ایک دو دعائیں، یہ سلسلہ ہے کہ ختم ہونے تا۔ اور دعائیں زیادہ تر حدیث کی۔ یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصن حصین کی قسم کی کوئی ب! شرم سے کٹا جارہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم اور مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے یہاں تو ان کی آدھی دعائیں بھی یاد نہیں ان کا ورد سفر تک میں رکھنا تو خیر الگ رہا یہاں دبھی نہیں! اب انتظار کہ نواب صاحب کا خشوع و خضوع کچھ کم ہولے تو ادھر اہل دنیا زبان کھلے مگر تو بہ اس کا موقع ہی کیوں آنے لگا۔ دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا نہ یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا! ——— ایک مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کرکے اور لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا صوبہ وار مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال اس کے قبل اپنی آنکھوں نے دیکھی تھی نہ اس کے بعد۔

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج!

ن نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر و باہمت سپاہی ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا، بے کسوں کا والی تھا، ملت کا پشت پناہ، وہ ایک امیر

گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور مجھ سے ان سے پہلی ملاقات جب حیدرآباد میں غالباً ۱۹۲۹ء میں میرے عزیز ترین دوست اور عزیز با مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کے مکان پر مولانا عبدالرحیم صاحب (سابق انجمن اسلامیہ والے اور حال تفسیر القرآن والے) کی وساطت سے ہوئی تھی تو میں بس اس قدر سمجھا تھا کہ ایک خوش مذاق وعلم دوست نوجوان ہیں! ان کے نفیس موٹر کی چمک دمک آج تک یاد ہے، دل و دماغ روح و ضمیر کے یہ حیرت انگیز

اور قابل صد رشک جوہر تو رفتہ ہی رفتہ کھلے۔

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو ہے، کیسے کیسے باغی، و طاغی، غدار و سرکش، اسّی بچاسی کی عمروں کے پورے عیش وعشرت کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور یہ مطیع و فرمانبردار بندہ، دین کا سپاہی، اور امت کا علمبردار چالیس ہی کی عمر میں ہی واپس بلا لیا جاتا ہے سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا۔ ؎

ما پروریم دشمن و مامی کشیم دوست

کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

روائتوں میں آیا ہے کہ خلیفہ برحق عمر فاروق رضی نے جب عین میدان قتال میں خالد سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ لوگوں کا تکیہ حق تعالیٰ سے زیادہ خالد پر ہو چلا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالد رض کی شجاعت و تدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں — عجب کیا، جو ایک مصلحت کچھ اس طرح کی اس جوانمرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو، ملت بہت زیادہ تکیہ اس شخص پر کر چلی تھی اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور رہو کہ جو خدائے قادر و توانا ایک بندہ کے توسط سے نصرت و کامرانی پر قادر ہے، وہی اسی واسطے کے بغیر بھی اسی طرح قادر و متصرف ہے۔

شعیب قریشی مرحوم

کراچی کی اطلاع ۵؍ فروری کی ہے کہ شعیب قریشی نے لمبی علالت کے ساتھ وفات پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بہت سی زبانوں پر سوال آجائے گا کہ یہ تھے کون؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

جواب کیا دیا جائے سوا اس کے کہ نیرنگئ دہر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ! بڑھے تو کیا سے کیا ہو گئے۔ اور گھٹے تو کیا ہو کر رہے۔

علی گڑھ کے رہنے والے اور وہیں کے ایک ممتاز ترین گریجویٹ۔ لڑکپن ہی میں ماں باپ بھائی بہن سب دو چار دن کے اندر وبائے ہیضہ کی نذر ہو گئے اور یہ بے خانماں اور بالکل بے سہارا رہ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد چودھری خلیق الزماں کے منھ بولے بھائی بن گئے۔ ایک آپریشن کے سلسلے میں ان کی والدہ کا خون ان کے خون سے مل گیا اور اس طرح رشتہ بھی خونی قائم ہو گیا۔ لیو بے باک غیور و خوددار ذہین و جفاکش شروع سے تھے۔ اور خدمت ملک و ملت کے دلدادہ۔ ۱۹۱۲ء میں بسلسلۂ جنگ بلقان ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن میں شریک ہو کر ٹرکی روانہ ہو گئے۔ انگریزی تقریر و تحریر دونوں پہ قادر۔ ۱۹۱۷ء میں جب غلام حسین مرحوم ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تو ان کے انگریزی ہفتہ وار نیو ایرا کی ایڈیٹری انھیں کے حصہ میں آئی۔ پھر کئی سال بعد احمد آباد میں گاندھی جی کی غیر حاضری میں ان کے شہرۂ آفاق ہفتہ وار ینگ انڈیا بھی چلاتے رہے۔ بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلہ میں لندن میں مسلم آؤٹ لک کی ادارت میں بھی

صدق جدید ۹؍ مارچ ۱۹۶۲ء

شریک رہے۔ جیل گئے اور مدت تک خلافت کمیٹی کے سکریٹری رہے۔ سنہ ۲۴ء میں جو مشہور وفد
خلافت حجاز گیا اس کے بھی سکریٹری تھے اور پھر دوبارہ جو دوسرا وفد مولانا ظفر علی خاں کی قیادت
میں گیا اس میں بھی شریک تھے اور وہیں ان سے اور صدر وفد سے اختلافات نمایاں ہو گئے۔
زمانہ ان کی شہرت عروج کے شباب کا تھا۔ بچّہ بچّہ کی زبان پر ان کا نام تھا۔ بڑے پختہ بلکہ کہنا چاہیے کہ گرم
قسم کے مسلمان تھے۔ کانگرس میں بھی بہت مقبول تھے اور جواہر لال نہرو کے دوستوں میں شامل
اکتوبر سنہ ۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ شائع ہوئی۔ تو یہ اس سے اختلاف کر کے کانگرس ہی سے
علاحدہ ہو گئے۔ نواب صاحب بھوپال ان پر مہربان ہوئے اور انھیں وزیر ریاست معزز کر کے
عالی مرتبت مشیر المہام بنا دیا گیا۔ اب یہ رئیس تھے سن اچھا خاصا آچکا تھا اور اب تک شادی نہ
ہو سکی تھی۔ پاکبازی میں ممتاز۔ آخر دوستوں کی رائے سے مولانا محمد علیؒ کی چھوٹی صاحبزادی سے
عقد کی ٹھہری اور جون سنہ ۱۹۳۰ء میں عقد ہو گیا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم دولھا والے بنے تھے
اور بارات انھیں کی کوٹھی سے عبدالرحمٰن صدیقی کے اہتمام میں قرول باغ پہونچی۔

قیام پاکستان کے زبردست حامیوں میں تھے اور پاکستان بنتے ہی ہجرت کر گئے۔ وہاں
یہ قدر ہوئی کہ مرکزی وزارت میں لے لئے گئے اور وہاں سے ہٹنے کے بعد عراق میں سفیر اور ہندوستان
میں ہائی کمشنر رہے —— گردش تقدیر ایک بار پھر رنگ لائی اور یہ عہدہ و منصب سے الگ
ہو کر گمنامی و گوشہ نشینی کی زندگی پر مجبور ہو گئے۔ رفیق حیات کا بھی انتقال ہو گیا۔ جوانی میں
تندرستی رعنائی و شادابی کے لئے ضرب المثل تھے اب ضعف و ناتوانی سے ٹوٹ کر ہر وقت
وقت موعود کے انتظار میں رہنے لگے۔ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید ڈائرکٹر سنٹرل ہیلتھ نے
۱۲ فروری کے خط میں مجھے لکھا۔

"کل صبح شعیب قریشی صاحب سے ملنے گیا علی الصباح کوئی ساڑھے سات
بجے۔ رات بھر یہی سنتے رہے کہ چند لمحوں کے مہمان ہیں ان کے داماد میرے قریب ہی
رہتے ہیں بڑی پریشانی رہی بہت دنوں سے دیکھا بھی نہیں تھا اسپتال ہی میں

ہیں۔ کمرے میں گیا تو دروازے ہی سے پہچان لیا۔ انھیں دیکھ کر طبیعت بہت پریشان ہوئی بس ڈھانچہ ہی رہ گیا مگر انھوں نے خوب پہچانا اور خوب باتیں کیں، ہوش وحواس مکمل قائم، ہاتھ جو بڑھایا ملانے کو تو برابر پکڑے رکھا جب تک میں نے خود نہیں ہٹایا۔ پنجے میں گرفت بھی اچھی خاصی تھی اور آتے وقت وہ خدا حافظی بھی نہیں تھی کہ احتمال ہوتا کہ بس آخری دم ہے۔ بڑے گردے کے انسان ثابت ہوئے خوب خوب جنگ کی ہے انھوں نے بیماری سے۔ دو آپریشن بلکہ یوں کہیے آپریشن پر آپریشن ہوئے۔ اور برداشت کر گئے ہیں۔ اب دیکھیے کہاں تک اور لڑائی کرتے ہیں ان کی خدمت بھی خوب ہوئی ہے ان کے داماد خود سرجن ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں شفا دے۔"

اسی کے چار ہی دن بعد ۶ ر فروری کو یہ بہادر مسلمان رخصت ہو گیا، رمضان کا مبارک [illegible] پایا اور اسی کی ۹ ر تاریخ۔

جسٹس سید محمود (فرزند سر سیدؔ) کی اچانک وفات پر اکبرؔ نے جو قطعہ کہا تھا بے موقع نہ ہوگا اگر اسے ایک بار پھر سامنے لے آیا جائے ؂

دل احباب سے نکلتی ہے آہ	نہ وہ بک گئے نہ سر سید
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ	ذات محمود سے تسلی تھی
لے حریفان شان وشوکت وجاہ	بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
رہ گیا لا الٰہ الا اللہ	مٹ گیا نقش احمد و محمود

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم [1]

ذاتی زندگی کی چند جھلکیاں

سنہ ۱۹۲۶ء ہے اور خلافت کمیٹی کا زور اس وقت تک بالکل ٹوٹا نہیں ہے مرکز
خلافت کمیٹی کی میٹنگ دہلی میں ہو رہی ہے میں شرکت کو گیا وہیں جلسے کے باہر ایک جوان
تندرست وجیہہ جوان کو دیکھا سفید براق کھدری شیروانی میں ملبوس سر پر دیسی
ستھری گاندھی ٹوپی چہرہ پر اچھی خاصی اور خوشنما سیاہ داڑھی جامعہ ملیہ والے سعید انصاری
(جواب ڈاکٹر سعید انصاری) کے ساتھ انھوں نے متعارف کرایا کہ تازہ ترین جرمن پلٹ
ذاکر حسین خاں یہی ہیں! اچھا وہی ڈاکٹر جن کی ذہانت و اخلاص دونوں کے چرچے
دِنوں سے سُننے میں آ رہے تھے جی ہاں ۔ شخصی تعارف یوں ہوا اور کچھ ہی دیر میں
باطن کا ایک جلوہ نظر آگیا جو بیرونی حضرات کمیٹی کے ممبروں سے اتنا قریب بیٹھے تھے کہ
کی ساری کاروائیاں ان پر ظاہر ہو رہی تھیں اور یہ بات آداب جلسہ کے کھلے ہوئی خلاف
تھی مولانا محمد علی نے پکار کر کہا آپ لوگ براہ کرم اپنی جگہ چھوڑ دیں ڈاکٹر صاحب
ملیہ کے ہونے والے پرنسپل بخوشی اس پر رضامند ہو گئے اور وہ جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑے
حالانکہ ان کے جونیر ساتھی اس میں اپنی توہین سمجھے اور انھیں روکتے رہے ۔ ڈسپلن
پابندی کی ایسی مثال ہم لوگوں میں شاذ ملتی ہے اور ہیں تو اس پہلی ملاقات میں

[1] صدق جدید ۱۶ مئی سنہ ۱۹۶۹ء

رح متاثر ہوا۔

۱۹۳۳ء تھا کہ مولانا سلیمان ندوی کے ہمراہ دریاآباد آئے اور دن بھر قیام کیا جامعہ
یہ کی پرنسپلی خود ایک معزز عہدہ ہے کسی صورت سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی اونچے
عہدہ دار ہیں اٹھنے بیٹھنے بات چیت ہر طرح سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خدمت گار
بیش کار ہیں یہاں کے ایک آدھ دیہاتی ٹیچر سے ملے اور ان سے کام کی باتیں کرتے رہے
ں قسم کے مشورے دیتے رہے کہ رہنے سہنے میں صفائی کا چلن چلائیے اسکول سے خالی
وقات میں محلہ کی سڑکوں کی صفائی کا کام کیجئے کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہتے بھولنا ہی نہیں
نہ والوں کا بھی۔ دلّی جا کر جامعہ میں بھی ملنا ہوا ہے جب ملے تو بالکل خُرد بن کر۔ جامعہ اور مطبوعات
موہ کے سلسلہ میں سچ رصدق کا پرانا نام) نے دوبارہ نکتہ چینی بھی کی کبھی اس سے کبیدہ و
زردہ نہ ہوئے تحریر میں خود صفائی پیش کی اور جب ملے تو سابق خندہ روئی سے کھانے کا
قت آگیا تو اپنے ساتھ کھانا بھی کھلایا اس نے دعوت شیراز کا لطف دیا۔ سادگی کے ساتھ
صفائی تو خاص ان کا جوہر ہی تھا۔

۱۹۳۵ء تھا یا اور کوئی سن علی گڑھ میں کوئی بہت بڑا جلسہ تھا کالج یا کانفرنس دونوں میں
ہاں کی جوبلی وہاں کئی دن ان کا ساتھ رہا صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
رحوم و مغفور میرے مخدوم و مکرم تھے لیکن اس وقت انھیں کی کسی بات پر ان سے شکر رنجی ہو
ئی اور میں نے ان کے ہاں جانے سے انکار کر دیا انھیں خبر ہوئی تو باوجود اس کے کہ ان سے
مرحوم سے سیاسی اختلاف تھا مجھے سمجھایا بجھایا منایا اور بالآخر ان کے ہاں بھیجکر چھوڑا۔
خالف پارٹی والے کے ساتھ اس مدارات و ملاطفت کا برتاؤ کہاں دیکھنے میں آتا ہے
پیکر شرافت تھے ۔ انگریزوں کو برا بھلا کہنا فیشن میں داخل تھا اور سخت ترین الفاظ

اچھے اچھوں کی زبان پر چڑھے رہتے تھے ڈاکٹر ذاکر باوجود اپنی معروف و معلوم حریت آگی
کے اس سے مستثنیٰ تھے نرم سے نرم تاویلیں ان کے افعال و اعمال کی کیا کرتے۔

۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء تھا یہ نئے وائس چانسلر علی گڑھ کے مقرر ہوئے تھے ان
کی صدارت میں پہلا جلسہ یونیورسٹی کورٹ کا تھا عبدالمجید خواجہ بیرسٹر اور پرانے نیشنلسٹ
بھی شریک جلسہ تھے جب میٹنگ ختم ہوئی لوگ چلنے لگے تو خواجہ صاحب نے ناخوشی کے لہجے
میں سب کے سامنے کہا۔ ذاکر صاحب اگر آپ سمجھتے ہیں جلسہ بہت کامیاب ہوا تو ایسا ہرگز نہیں
ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر بگڑ جاتا مگر یہ ذرا بھی نہ بگڑے خردانہ انداز سے اور نرم لہجہ
ان سے کہتے ساتھ چلے جا رہے تھے "جی نہیں میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ جلسہ مثالی طور پر کامیاب
رہا۔" ایسی شرافت کی مثالیں پبلک زندگی میں کم ہی نظر آئیں گی۔

۱۹۴۹ء ہوگا کہ کورٹ کی ایک اور میٹنگ دوپہر کے لنچ کے لئے برخاست ہوئی اور
اب کی میٹنگ یونین عمارت میں نہیں بلکہ یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں تھی خیال آیا کہ نماز یہاں
کون پڑھے گا، دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صاحب بغیر شیروانی کے محض ایک کرتہ پہنے لوٹا ہاتھ میں
لئے ہوئے غسل خانہ وضو کے لئے جا رہے ہیں دیکھا تو خود وائس چانسلر تھے اور جب وہ آکر
جانماز پر بیٹھ گئے تو دیکھا دیکھی کچھ ممبر اور بھی آگئے۔ نماز کے تو اس وقت پورے پابند تھے اور
روزے کے بھی اور حج اس کے چند سال بعد جا کر اپنے زمانہ نائب صدارت میں کر آئے ــــ
ذکر ان کے عام انسانی اخلاق و عادات کا ہو رہا تھا ضمناً ان کی عبادت بھی آگئی۔

سال اب یاد نہیں بہرحال ان کی جامعہ کی پرنسپلی کا زمانہ تھا یونیورسٹی کورٹ کی
میٹنگ میں وہ دلی سے آئے اور میں دریاباد سے پہونچا رشید صدیقی کے یہاں ہم دونوں
اترے ان کا کمرہ میرے کمرے سے متصل تھا فجر میں ابھی خاصا وقت باقی تھا کہ آہٹ محسوس
ہوئی دیکھا تو ڈاکٹر صاحب غسلخانہ سے وضو کر کے باہر آچکے ہیں اور جانماز پر بیٹھے کوئی دعا

کرتے ہیں۔ شاہ طالب حسین فرخ آبادی کے مرید عرصہ ہوا ہو چکے تھے۔ میں نے خود انھیں تہجد
پڑھتے نہیں دیکھا لیکن عجب نہیں کہ پھر بھی عمر کے اس دور تک وہ تہجد کے پابند رہے ہوں۔۔
اس کے بعد میں تڑکے نماز با جماعت فجر کے لئے روانہ ہو گئے۔ قرآن مجید کی عظمت بھی اس وقت
تک اچھی خاصی ان پر غالب تھی۔ جامعہ سے کوئی صاحب اعلا تعلیم کے لئے یورپ جا رہے
تھے ڈاکٹر صاحب نے وداعی تقریب میں چلتے وقت انھیں ایک چھوٹے سائز کی کتاب پیش
کی اور کہا یہ کتاب آڑے وقتوں آپ کی مدد کرے گی جیسی کہ آپ سے قبل بہتوں کی کر چکی
ہے اور یہ کتاب قرآن کی ایک حمائل تھی۔ ان کے خاص فن تعلیمات اور معاشیات تھے اور ساتھ
ہی فلسفہ کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت کے مترجم تھے لیکن دوسری
طرف تفسیر قرآن سے بھی انسیت رکھتے تھے۔ تفسیر ماجدی جلد اول شوق سے دل لگا کر پڑھی
اور دوسری جلد کی طباعت اور اشاعت کے لئے ایک ہزار کی رقم اپنی طرف سے پیش کی
گو کہ میں اسے قبول نہ کر سکا۔

سنہ غالباً ۵۲ء تھا۔ وہ بہار کے گورنر تھے میں پٹنہ جانے لگا تو اپنے یہاں
ٹھہرنے کی فرمائش کی۔ اسٹیشن جو موٹر میرے لئے آیا وہ عجیب طرح کا تھا یعنی بالکل بند اور
شیشوں پر کپڑا بندھا ہوا۔ اے۔ ڈی۔ سی۔ صاحب نے بتایا کہ یہ موٹر سرکاری نہیں ڈاکٹر
صاحب کا ذاتی اور ان کی ملک ہے۔ مرحوم سرکاری چیزوں سے کام لینے میں ایسے ہی احتیاط
برتتے تھے۔ میری خدمت کے لئے جو ملازم صاحب تعینات تھے وہ بھی ان کے ذاتی ملازم (دیہاتی
اسحاق) تھے کوئی سرکاری چپراسی میرے قریب نہ آپاتا تھا۔ یہ معیار ان کی دیانت کا تھا میرے
پہونچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے نہیں میرے ساتھ کے ملازم
سے پوچھا، آپ (تم نہیں) کھانا کھا چکے ہیں اب آرام سے سوئیے۔ ملازم صاحب کی آنکھیں
گورنر صاحب کے اس التفات کو دیکھ کر کھلی رہ گئیں۔ جب تک میرا قیام وہاں رہا وہ مرتب میزبانی

اسلامی اخلاص و آداب کے ساتھ ادا کرتے رہے، ان کی نائب صدارت کے زمانہ میں دوبارہ دلی جانا ہوا اور انھیں کے ہاں ٹھہرنا ہوا، روزانہ صبح سویرے پیدل ٹہلنے کے لئے روانہ ہو جاتے واپسی پر سیدھے میرے کمرے میں آتے، دریں اثنا میری چائے آچکی ہوتی میرے پاس کچھ دیر بیٹھ کر اور میری خیریت دریافت کرکے اندر جاتے۔ دہلی کے انگریزی روزنامے سب اس وقت تک آچکے ہوتے، حکم تھا کہ سب سے پہلے میرے پاس آئیں اور جتنی دیر بھی چاہوں انھیں رکھ کر انھیں واپس کروں جب جاکر خود پڑھتے، کھانا اکثر و بیشتر اپنے ساتھ ہی اپنی میز پر کھلاتے سلام میں ہمیشہ خود ہی سبقت کرتے۔

خط و کتابت بلا ضرورت نہ کرتے، پھر بھی سال میں اوسطاً دو چار خطوط تو آہی جاتے میرے پاس تقریباً ۷۰ خط محفوظ ہوں گے۔

۲۷ء سے ۶۹ء تک ۴۲ سال کے تعلقات کی مدت کم نہیں ہوتی، ذاتی کردار کی جھلکیاں آپ نے دیکھ لیں، رہی پبلک زندگی سو اس میں ہر بڑی شخصیت کی طرح بڑی گنجائش قیل و قال کی ہے اس پر خود اگر کوئی تبصرہ مناسب نہیں، جب کہ مرحوم کے عزیز دل (بھائیوں لڑکیوں، نواسیوں وغیرہ) کے دل اتنے دکھے ہوئے خصوصاً آپ کی حرم محترم اور تازہ بیوہ جن کی بادشاہی پلک جھپکاتے اپنے لفظی معنی ہی میں لٹ گئی ہے، اور جو پرانی ہی عابدہ صابرہ اور سخت قسم کی پردہ نشین اور شوہر کی خدمت میں آخر وقت تک رہنے والی درویش صفت صاحب ایمان خاتون ہیں اس وقت اس بوڑھے کی دعا بس یہ ہے کہ اللہ آمرزگار ان کی لغزشوں کو (اور لغزشیں انبیا معصوم کے سوا اور کس سے نہیں ہوتی ہیں) معاف فرمائے اور حشر میں ان کو نصیبہ ور کرے، مرحوم نے سالہا سال سے نماز جمعہ ترک کردی تھی، خیال یہ ہوتا ہے کہ ایسا شاید اعلا عہدہ کی بنا پر اپنی جان کے خطرے کے خیال سے ہے مگر خود مرحوم نے ایک صاحب سے بیان فرمایا کہ میرے گھٹنوں میں سخت تکلیف رہتی ہے جس سے دوزانو

بیٹھنا التحیات کے لئے ممکن نہیں گھر پر نماز چوکی پر سے پیر لٹکا کر پڑھ لیتا ہوں، مسجد میں یہ صورت کہاں ممکن "اللہ ایسا کرے کہ ان کے ہر قابل اعتراض عمل پر ایسی ہی توجیہ دتا دل حشر میں میں نکلے بندے تو صرف ظاہری عمل کو دیکھتے ہیں باقی فاعل کی نیت اور اس کی مجبوریوں اور معذوریوں کا علم کس کو؟ ہزارہا بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی مخلصانہ دعائیں بڑے مجمع کے ساتھ جنازے کی نمازیں اور بے شمار قرآن خوانیاں ہرگز ضائع ہونے والی چیز نہیں.

چودھری خلیق الزماں مرحوم

○

فروری سنہ ۴۶ء کی کوئی تاریخ ہے، یوپی اسمبلی کے الکشنوں کا زمانہ ہے آج چودھری خلیق الزماں کے الکشن کا دن ہے، مسلم لیگ کے وقار و عزت، کے امتحان کا دن ہے، چودھری یا کہنا چاہیے کہ صوبہ مسلم لیگ کی خدائی اپنا خدائی کر رہے تھے، حریفوں نے اپنی پوری قوت آج اس مقابلہ پر لگا دی ہے، کانگریس تو خیر مخالف تھی ہی "سنی بورڈ" نے امیدوار کھڑا کر کے بہت سے ووٹ اہل سنت کے ادھر نکال لیے ہیں۔ اور ایک شیعہ امیدوار بھی میدان میں ہے چودھری صاحب سالہا سال سے لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر رہ چکے تھے، جتنے مخالف اس سلسلہ کے تھے سب کی آج بن آئی ہے۔ کئی دن سے خوب مظاہرے ہو رہے ہیں اور جلوس پر جلوس مخالفانہ نعرے لگاتے ہوئے نکل رہے ہیں چھوٹے اور بڑے جتنے ذاتی اور قومی کسی سبب سے بھی چودھری صاحب سے کوئی رنج دل میں رکھتے تھے آج سب ہی دل کے حوصلے نکال رہے تھے اور ان کے ہرانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے ——— پھر چودھری صاحب آخر اس کا کچھ توڑ نہیں کرتے، ان کے ہمدردوں کا جلوس کیوں نہیں نکلتا، ایک جلوس کو چھوڑ کر، وہ

صدق جدید یکم جون سنہ ۱۹۷۳ء

نہ تو اپنے موافقوں کا جلوس نکلواتے ہیں نہ اپنے معتقدوں اور ہمدردوں کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ملت کے ووٹروں پر ہی اعتماد کیے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان اب دوست دشمن کو خوب اچھی طرح پہچان گیا ہے مجھے کسی جلوس کی کیا ضرورت ہے نتیجہ نکلا تو خود دنیا نے دیکھ لیا کہ انھیں کا اندازہ صحیح نکلا۔ مخالف بری طرح ہارے اور جھنڈا لیگ ہی کا بلند رہا!

یہ تھے چودھری خلیق الزماں جن کی پبلک زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک آپ نے دیکھ لی۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے کا کوئی سنہ ہے چودھری صاحب کی والدہ اپنے ایک بڑے لڑکے کی شادی کی تاریخ مقرر کر رہی ہیں۔ منگنی اپنی سگی بھانجی کے ساتھ مدت ہوئی ٹھہرا چکی ہیں۔ عین وقت پر معلوم ہوا کہ صاحبزادے وہاں نکاح کرنے پر آمادہ نہیں، لڑکی کی صورت و سیرت میں کچھ عیب نکال کر نکاح سے سرے سے انکار کر رہے ہیں ——

"ارے! یہ تو بڑے غضب کی بات ہوئی، سوچ رہی تھی کہ اپنی سگی بھانجی کو گھر کی بہو بناؤں گی۔ برادری بھر میں کیسی ناک کٹ رہی ہے۔ کتنی بڑی بدنامی ماں باپ کی ہو رہی ہے!!" گھر میں رونا پیٹنا پڑ گیا۔ اس گھڑی چھوٹے بھائی نمودار ہوتے ہیں۔ ماں کے پاس آکر کہتے ہیں کہ امی جان آپ دل نہ میلا کیجیے، بھائی جان نے اگر انکار کر دیا تو میں حاضر ہوں، لڑکی جیسی کچھ ہے ظاہر ہے لیکن آپ کی بات جا رہی ہے، میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں عقد کر لوں گا دل پر تو اختیار نہیں البتہ جہاں تک ظاہری برتاؤ کا تعلق ہے میں شادی ساری عمر نباہ دوں گا خرچ وغیرہ برابر دیتا رہوں گا اور آگے چل کر آپ کی ایک دوسری بہو اپنی مرضی کے مطابق لانے کی اجازت آپ سے لینا ہوگی!" ماں اس سعادت مندی سے باغ باغ ہو گئیں، سوکھی کھیتی میں پانی پڑا تقریب ہنسی خوشی ہو گئی اور ساری عمر نباہ ہو گیا۔ اولاد بھی ان بیوی سے ہوئی۔ ان

یوی کا چند سال ہوئے لاڑکانہ (سندھ) میں انتقال ہو گیا۔ دو لڑکیاں بیاہ ہو کر ہندوستان
ہی میں رہیں۔

انھیں ماں کا جب آخری وقت آیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چودھری صاحب پاکستان
ے جب انھیں دیکھنے آئے تو ان کے پاؤں داب رہے ہیں۔
یہ ایک دوسری ہلکی سی جھلک چودھری صاحب کی خانگی اور نجی زندگی کی تھی۔

یہ دو نمونے چودھری صاحب کی ساری زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ تفصیل جو کچھ بھی جو کوئی
ے گا وہ اسی متن کی شرح ہوگی ——— میرے عزیز تھے، اور کچھ ایسے دور کے نہیں
یری والدہ ان کے والد کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اصل وطن شہر لکھنؤ سے متصل قصبہ بجنور کا
ضع چلا آدان تھا۔ نسب کے بڑے کھرے شیخ صدیقی تھے، اودھ کی سلطنت قائم ہونے سے پیشتر
ہی شیخ زادے یہاں عملاً حکمراں تھے، ان کا قبرستان جہاں ان کے مورث اول شیخ عبدالرحیم
دفون ہیں، نادان محل روڈ لکھنؤ میں اس وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ نسباً قدوائی
یں، لکھنؤ کے ان شیخ زادوں اور بانسہ کے سادات سے قرابتیں قائم کر کے قدوائیوں کا
ب بھی معیاری بن گیا۔ سن میں مجھ سے ساڑھے تین سال بڑے تھے، پیدائش ۱۸۸۹ء
ن تھی۔ اسکولی تعلیم لکھنؤ کے کوئنس اسکول میں پائی۔ کھیل میں بہت اچھے تھے، اور ذہین
طباع اور شوخ مزاج۔ کالج میں تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے۔ اور بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی
گریاں وہیں سے لیں۔ غالباً ۱۹۱۱ء میں سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا، ابھی پڑھ ہی رہے
ے کہ جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سے شروع ہو گئی اور
لی گڑھ کے طلبہ میں گویا زلزلہ آ گیا۔ مولانا محمد علی کا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ کلکتہ سے دہلی آ
یا تھا اور اپنے شباب پر تھا، مولانا نے طبی وفد، ترکی زخمیوں کی دیکھ بھال کیلئے ڈاکٹر
صاری کی سرکردگی میں ترکی بھیجا، اس میں جو شوق سے والنٹیر بنے ان میں ایک چودھری
ماحب بھی تھے۔ شعیب قریشی، عبدالرحمن سندھی وغیرہ سے گہری دوستی اسی سلسلہ میں

ان سے پیدا ہوئی۔

حقیقی ماموں لکھنؤ کے مشہور وکیل حاجی محمد نسیم مرحوم تھے، تعلیم و تربیت انھیں نے دلوائی اور بطور جونیر وکیل کے اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے لڑکے محمد وسیم مرحوم اور ان کے ممیرے زاد بھائی ہونے کے علاوہ ان کے بہنوئی بھی تھے، لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر بنے پاکستان بنتے ہی وہاں منتقل ہو گئے۔ اور ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے۔

سیاسی عقیدت علی برادران سے رکھتے تھے، مولانا محمد علی کے خصوصی عقیدت مند بس چند تھے۔ ان کے دو گروہ تھے، پہلے گروہ میں عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی، اور ایک زمانہ تک، ڈاکٹر ناظر الدین حسن تھے۔ اور دوسری ٹولی میں ولایت علی (مرحوم) شعیب قریشی اور عبدالعزیز انصاری کے ساتھ چودھری صاحب بطور سرگروہ تھے اور جو سبق جمال الدین افغانی اور اقبال وغیرہ نے اتحاد اسلامی کا دیا تھا اسی راگ کے مغنی تھے ——— ملکی سیاست میں گاندھی جی کے بعد سب سے زیادہ متاثر پنڈت موتی لال نہرو سے تھے، اور جواہر لال نہرو بقول شخصے اپنا لنگوٹیا یار سمجھتے تھے۔ خلافت ترک موالات کے دوران میں صوبہ کی کمان انھیں کے ہاتھ میں تھی، اور فرنگی محل میں کبھی مل کر اور کبھی لڑ کر خلافت کمیٹیاں وہی بناتے اور بگاڑتے رہے۔ برسوں کانگریس میں شریک رہے بلکہ جس زمانہ میں ایک فرد کانگریس کا ڈکٹیٹر ہوا کرتا تھا وہ اس کے ڈکٹیٹر بھی رہے تھے، اس کے بعد مسلم لیگ میں آ گئے۔ پاکستان کا مطالبہ اس بلند آہنگی سے کیا کہ گویا جناح صاحب کے بعد انھیں کا نمبر تھا، مسلم لیگی ہونے کے باوجود ذاتی تعلقات ہندو دوستوں سے برابر باقی رہے، سر تیج بہادر سپرو، ہر کرن ناتھ مسرا، پنڈت شنکر ناتھ بھٹ وغیرہ سے تعلقات ویسے ہی رہے جیسے پہلے کسی زمانہ میں تھے لکھنؤ میونسپل بورڈ کے صدر متعدد بار ہوئے، کسی مسلمان کیلئے ایک ہی بار ہونا ایک بڑا اعزاز تھا چہ جائیکہ بار بار ہونا۔ سنی وقف بورڈ کے صدر رہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں مہاراجہ محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بھی کچھ دن رہے تھے۔

لکھنؤ میں جو چند مسلم گھرانے بطور مستقل مہمان سرا کا کام دیتے تھے ان میں علاوہ مولانا
[عب]د الباری فرنگی محلی، مہاراجہ محمود آباد، مولوی محمد نسیم مرحوم کے ڈالی باغ کے ایک گھر ان کا بھی
[تھ]ا، خیالی گنج میں ــــــ اور یہ گھر سیاست دانوں کا مرکز تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کے
[بننے] بگڑنے کے فیصلے وہیں سے ہوتے رہتے تھے۔۔

جلسہ میں نعرۂ تکبیر کی کثرت ان کے جلسوں کی خصوصیت تھی۔ آہ کہ ۱۹۴۶ء کے بعد

[...]ے ان کے سننے کی حسرت سیاسی جلسوں میں رہ گئی۔ (حاجیوں کی روانگی اور واپسی کے قافلوں
[کے] ساتھ ان کا بلند ہونا بالکل الگ ہے)

پاکستان کے قیام کے بعد اعلان یہ ہوا تھا کہ جناح صاحب انھیں کو ہندی مسلمانوں کی
[ر]ہبری اور رہنمائی کیلئے ہندوستان میں چھوڑ گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کی قسمت میں کوئی تعمیری
[پرو]گرام اب کہاں تھا۔ انھیں بھی جلدی ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اپنی ہجرت کے اسباب انھوں
[نے] اپنی انگریزی کتاب PATHWAY TO PAKISTAN میں اور اس سے بھی زیادہ شرح و بسط
[کے] ساتھ اردو کتاب شاہراہ پاکستان میں لکھ دیئے ہیں دستیاب ہو سکے تو اسے ضرور پڑھیے

چودھری صاحب کی بے شمار تقریروں میں سے صرف ایک ذرا سا فقرہ یاد رہ گیا ہے
[ا]پنی قیادت کے زمانہ میں لکھنؤ کی پبلک کے سامنے ایک بار کہا تھا کہ:ـــ

"آپ کو روز گرم پیالی چاہیئے، میں ہر روز گرم پیالی آپ کو کب تک پلایا کروں"۔

پاکستان پہنچ کر ان کی کچھ زیادہ قدر نہ ہوئی، کچھ دنوں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم کرتے رہے
[لیکن] خود لیگ ہی کے کچھ دن کے بعد لالے پڑ گئے تھے، خدا معلوم کتنی پارٹیاں وہاں نکل پڑیں۔
[حکو]مت کی طرف سے ایک بار انڈونیشیا میں سفیر ہو کر گئے تھے، اور ایک بار مشرقی پاکستان کے
[گور]نر ہوئے تھے، جناح صاحب سے تعلقات اچھے نہیں باقی رہ گئے تھے۔ ہندوستان جب
[...]آ جاتے تھے تو ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ پنڈت نہرو اور پنت جی بہت بڑھ کر ملتے ــــ جس
[زمانے] میں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے ایک بار ہوائی جہاز سے دہلی سے گزر رہے تھے، اخبار والا

میں تصویر آئی کہ یہ کھڑے ہوئے ہیں اور استقبال کیلئے رفیع احمد قدوائی مرکزی وزیر موجود
ہیں، دونوں کے تعلقات سے جو واقف تھا اسکے لئے تصویر مرقع حسرت تھی۔ کل تک جو جگری دوست
تھے فکر و عمل دونوں میں ہم رنگ و ہم آہنگ۔ قرابتوں کی زنجیروں میں بھی جکڑے ہوئے تھے آج
ایک دوسرے سے بیگانے ہی ہیں، غیروں اور بیگانوں کی نہیں عین دشمنوں کی نظر سے ایک
دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ہند اور پاکستان کہاں کے دوست اور کیسے پڑوسی، یہ معلوم ہوتا

ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن پشتہا پشتوں سے چلے آرہے ہیں، خیر یہ منزل بھی جھیلنا دونوں کی قسمت
میں تھا۔

مسلمان ہمیشہ سے رہے، اور مربی و سرپرست ماموں حاجی محمد نسیم مرحوم کی دینداری اور
مذہبیت تو ضرب المثل تھی۔ والدہ ماجدہ بھی دینداری میں شہرت رکھتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ
مذہبیت میں بھی ترقی ہوتی رہی، عمر کے آخری ۱۰ - ۱۲ برسوں میں مرحوم نماز اور تلاوت قرآن کے
شدت سے پابند ہوگئے تھے، مجھ ہیچمداں کی تفسیر کی بڑی ہی قدر افزائی کرتے رہے، خط کبھی کبھی
آتے ان میں یہ مضمون بھی ہوتا کہ "تمہاری تفسیر بار بار پڑھ رہا ہوں اور بڑی حسرت یہ ہو رہی ہے کہ
سیاست میں پڑ کر اپنی عمر ضائع کردی، کاش تمہاری طرح دینی خدمت میں لگ جاتا۔"

پاکستان کی خستہ حالی اور زبوں بختی سے نہایت درجہ غمگین اور افسردہ خاطر رہتے۔ اپنی
ساری کھیتی کو اجڑتے اور سوکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ہفتوں بلکہ مہینوں سے
مسلوب الحواس سے ہو رہے تھے، آخر میں حافظہ بڑی حد تک جواب دے گیا تھا، ساری
چیزیں بھول گئے تھے، جب نوبت آکسیجن سے سانس لینے کی آگئی تو شاید ہماری وزیر اعظم
صاحبہ نے خاندانی تعلقات کا خیال کرتے ہوئے ان کی دونوں بیاہی ہوئی لڑکیوں کو کراچی
جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن بعض اتفاقات کے باعث یہ دونوں انتقال کے بعد ہی
وہاں پہنچ سکیں، اس سے قبل ملت کا یہ خادم جمعہ کے دن اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہوگیا۔

ڈاکٹر سمپورنانند آنجہانی

○

۱۰ جنوری کو خبر آئی کہ یو۔پی کے مشہور بلکہ آل انڈیا شہرت پائے ہوئے ڈاکٹر سمپورنانند رحلت کر گئے۔ عرصہ دراز سے اپنے وطن بنارس میں بیمار چلے آرہے تھے۔ یو۔پی میں کئی سال تک وزیر تعلیم رہے اور پھر پنت جی کے مرکز چلے جانے پر بجائے حافظ محمد ابراہیم کے وزیر اعلا بھی ہو گئے۔ اس سے استعفا دینے کے بعد راجستھان کے گورنر مقرر ہو گئے اور مدتوں اسی عہدہ پر رہے۔ کاشی ودیا پیٹھ کے وائس چانسلر تھے۔ ہندی کے نامور ادیب تھے انگریزی میں عبور رکھنے کے علاوہ فرانسیسی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے اور فارسی اردو پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اردو سے متعلق ان کا جو مسلک تھا وہ سب کو معلوم ہے

منقول از صدق جدید ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

اس کے باوجود اُردو سے دلچسپی اور واقفیت دونوں خوب رکھتے تھے اور مشاعرے خوب کرتے تھے اور بعض مشاعروں میں غزل بھی آنند کے تخلّص کے ساتھ سناتے تھے غزل کا مضمون عاشقانہ نہیں صوفیانہ ہوتا تھا خصوصاً وحدت الوجود کا ــــ مغربی فلسفہ ہندو فلسفہ اور فن جوتش میں بھی خاصہ درک تھا۔ آخر برسوں میں کئی سال تک ہندی کمیٹی کے صدر رہے جس کی ایک شاخ اُردو کی بھی تھی۔ اس کمیٹی کا ایک ممبر مدیر صدق جدید بھی تھا اسے جب ان سے مراسلت کی ضرورت پڑتی تو وہ خط اردو میں لکھتا اس کا جواب بھی وہ پابندی کے ساتھ اُردو ہی میں دیتے اور اردو مصنفین کے سرکاری انعام واکرام کے معاملہ میں بھی کسی بخل یا ناانصافی سے کام نہ لیتے۔ بہ حیثیت سرکاری مہمان کے بھی جب جب جے پور گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا انھوں نے کوئی فرق نہ اُردو ہندی والوں میں آنے دیا اور نہ ہندو مسلم مہمانوں کی خاطرداریوں میں ــــ علم جوتش میں بھی خاص دخل تھا اور سُنا ہے کہ ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں جب کسی مسلمان کا معاملہ آپڑتا تو پورے ضابطہ کا برتاؤ رکھتے اور کسی تعصب مذہبی کو راہ میں نہ حائل ہونے دیتے۔ عمر کچھ کم ۸۰ سال کی پائی۔

سر سکندر حیات[۱]

○

سر سکندر حیات خاں مرحوم کی ختم حیات کی خبر آپ نے اخبارات میں پڑھ لی؟ ماتم کی صدائیں جو ملک بھر میں گونجیں، وہ بھی سُن لیں؟ صوبہ اور پنجاب جیسے زبردست صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے اپنے اثر واقتدار کے لحاظ سے سارے ہمعصروں سے بڑھ چڑھ کر تدبر و فرزانگی میں لاجواب، سوجھ بوجھ میں فہم و دانش میں اپنی نظیر آپ. عملاً وزیر نہیں، تاجدار تھے. نائب نہیں خود مختار تھے. ماتحت نہیں سالار تھے بڑھ چکے تھے. بڑھ رہے تھے اور خود تو بڑھ ہی رہے تھے اوروں کو بھی بڑھاتے تھے. اچانک اور حسرتناک موت کی خبر سننے کے لئے دوست دشمن کوئی بھی تیار تھا؟ اس کا گمان بھی تھا؟ اچھے خاصے ہٹے کٹے، تندرست و توانا، مضبوط چہرہ گل تر کی طرح شگفتہ، صحت فصل بہار کی طرح شاداب و تازہ، موت عین شادی کے گھر میں، عین شادمانی کی گھڑی میں آئی! بڑے نورِ نظر اور چھوٹے لختِ جگر کے سہرے کے کھِلے ہوئے پھولوں کو روندتی ہوئی، مسلتی ہوئی، کچلتی ہوئی، پھر کوئی جنگل بیابان نہیں، گاؤں اور دیہات نہیں. لاہور جیسا متمدن شہر، بہتر سے بہتر حکیم، حاذق سے حاذق ڈاکٹر، بلانے کے لئے ٹیلیفون آنے کے لئے موٹر، سکنڈوں میں خبر ہو گئی، منٹوں میں ڈاکٹر آئے، موت کے فرشتوں کی رفتار دونوں سے تیز تر نکلی — جو ہستی مجسم حیات تھی جس کی رگ رگ میں زندگی اور قوت کی تیز نبض اچھل رہی تھی، آناً فاناً بجھ گئی، ختم ہو گئی. قبل اس کے کہ علاج و تدبیر کوئی ادنیٰ بھی ہو سکے!

دنیا ایک بڑی اور اسی سکندر نام کی ایک اور شخصیت سے بھی واقف ہے. اقبالمندی اور دنیوی خوش قسمتی کے لحاظ سے ان مرحوم سے بھی کہیں برتر. وہ دنیا کا فاتح اعظم تھا. سارا یونان فتح کیا، ایران کو مسخر

---

[۱] صدق ۱۸ فروری ۱۹۴۳ء

کیا طارا کا تختہ الٹ دیا، عراق میں، توران میں اپنا جھنڈا لہرایا، خراسان کو، شمالی ہندوستان کو زیر کیا بلخ کو، بخارا کو، ترکستان کو تابع فرمان کیا۔ عین زمانہ شباب میں عالم مسافرت میں خود اپنا وقت موعود آپہونچا تو زور آوری ختم تھی۔ اور ساری کوششیں تدبیریں بے اثر۔ مقررہ گھڑی، ایک سکنڈ کے لئے، ایک سکنڈ کی باریک سے باریک کسر کے لئے نہ بڑھ سکی نہ پیچھے ہٹ سکی۔!

جاہ حشم کی خوش تدبیری، طبیبوں کی حذاقت، تیمارداروں کی دردمندی اگر کہیں بھی سپر بن سکتی تو ماضی میں سکندر یونانی اور حال میں سکندر پنجابی یقیناً موت کی گرفت سے باہر رہے ہوتے! غفلت کے بندو! عبرت کی آنکھیں اب بھی بند ہی رکھوگے؟ خودی کے متوالو ہوش اب بھی نہ آئے گا؟ سکندر مقدونی کا انجام تو اللہ کو معلوم۔ سکندر پنجابی کا حال اللہ کے کرم سے ہم پر آپ پر سب پر روشن ہے۔ الحمد للہ کہ مسلمان تھا۔ ہمارا بھائی تھا۔ توحید کا قائل، رسالت کا معتقد، اسلام کا کلمہ گو محمدؐ کی امت میں شامل، نماز کا پابند، روزہ کا شدت سے پابند۔ کلام الٰہی کی اشاعت کا ساعی اپنی بصیرت کے مطابق امت محمدیؐ کی فلاح کا داعی، اپنے کو عمر بھر مسلمان کہا، مسلمان سمجھا اور ظرف ماحول لحاظ کے موافق اپنے کو مسلمان بنایا اور رکھا، فیلڈ مارشل ویول کے پیام، رائٹ آنریبل چرچل کے سلام، فوج کی سلامیاں، لاٹ صاحب کے ہاں کی حاضر باشیاں، سب جسم کی کشاکشیں تھیں، یہیں زیرزمین دفن ہوگئیں۔ روح عرفانی لطافتوں کے پانی سے دھل کر اور نکھر کر ان آلائشوں سے پاک ہوئی اور ان قیدوں سے آزاد ایمان کے بازوؤں سے چڑھی اور یقین و اعتقاد کے پروں سے عالم بالا کی سمت میں بلند ہوئی، ہزارہا دل والوں کی دلی دعاؤں کے ساتھ، ہزاروں آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ۔

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی!

~~~
~~~

شاعر، ادیب و صحافی

مرزا ثاقب[1]

بات یہ ۱۹۱۳ء کی ہے۔ لکھنؤ کے خوش ذوق رئیس چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقدار گڑھی بھلول نے رقعہ لکھکر مجھ سے دریافت کیا کہ ایک ادبی حلقہ میں ذیل کے دو ہم مضمون شعروں کے متعلق بڑی بحث چھڑی ہوئی ہے، محاکمہ آپ کیجیے، دونوں شعر یہ ہیں:۔

(۱) شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو
سر یہ ٹکرایا کہ در کر دیا دیواروں کو

(۲) شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

شعر بادی النظر میں اور پہلی دفعہ پڑھنے میں پہلا ہی اچھا معلوم ہوا لیکن ذرا سوچنے کے بعد بعد ترجیحی رائے دوسرے شعر کے حق میں قائم ہوئی اور یہی میں نے چودھری صاحب کو جواب میں لکھ بھیجا۔[2]

---

[1] مولانا دریابادی کا یہ مضمون ۵ر دسمبر ۱۹۴۶ء کے روزنامہ تنویر لکھنؤ میں مرزا ثاقب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد شائع ہوا تھا۔ (ع۔ ق)

[2] مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے تو اولاً پہلا ہی شعر پسند آیا تھا لیکن پھر مولوی عبدالسلام ندوی رفیق دارالمصنفین (صاحب شعر الہند) سے مشورہ لیا تو انھوں نے دوسرے شعر کو ترجیح دی اور بڑی حد تک ان کی رائے سے متاثر ہو کر میں نے اس دوسرے شعر کو ترجیح دی۔ پہلا شعر میر نفیس مرحوم کا تھا۔ (ع۔ ق)

پہلے شعر میں لفظوں ہی کا زور ہے۔ ورنہ اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے قید خانے کی دیواریں محض ٹوٹ پھوٹ کر محض در کی طرح کھلی رہ جائیں۔ حد فطرت سے بڑھا ہوا ہے۔ اور پھر جب زنداں کی دیواریں ہی باقی نہ رہیں تو خود زنداں کا وجود کب باقی رہ گیا۔ قیدی آزاد ہو کر نکل ہی نہ بھاگیں گے، دوسرا شعر بے عیب ہے بلکہ کچھ کچھ نے انتہائی حسرت و بے کسی کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تاریکی اس بلا کی ہے کہ قیدی کو یہ خفیف سی روشنی بھی بہت غنیمت معلوم ہو رہی ہے۔ پھر اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے دیوار میں ہلکا سا رخنہ پیدا ہو جائے حد و فطرت سے اس درجہ بعید بھی نہیں۔

غرض اپنی یہی رائے لکھ کر بھیج دی اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ پہلا شعر کس کا ہے اور دوسرا کس کا۔ چودھری صاحب تو خیر خوش ہوتے ہی وہ ہی ایک روز بعد دیکھتا کیا ہوں کہ جناب مرزا ثاقب صاحب غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں (میرا قیام اس وقت تک لکھنؤ ہی میں تھا) آئیں! یہ مرزا صاحب کہاں! ان کی تو نازک مزاجی (نازک خیالی بھی) کی طرح مشہور ہے یہ تو بڑے بڑوں کے ہاں نہیں جاتے۔ مجھ غریب طالب علم کے ہاں (کالج اسی زمانہ میں چھوڑا تھا) کہاں قدم رنجہ فرمانے لگے۔ میں تو دور سے راستہ گلی میں بس ان کی صورت دیکھ لیتا تھا۔ کبھی بڑھ کر ملنے کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی چہ جائیکہ انھیں اپنے گھر پر دیکھتا

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

خیر بیٹھے تو فرمایا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں چودھری صاحب۔ نے آپ کا وہ خط مجھے دکھایا۔ آپ نے نقادی اور انصاف کا حق ادا کیا ورنہ وہ شعر تو میر۔۔۔ صاحب مرحوم و مغفور کا ہے۔ ان کے سامنے بھلا کون پوچھتا!

میں نے یہ سن کر اپنے دل میں کہا کہ چلو اچھا ہوا اپنے کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ کون شعر کس کا ہے۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ میر۔۔۔ صاحب کا نام سن کر مجھ پر بھی رعب پڑ جاتا اور انھیں کے شعر کو ترجیح دینے لگتا۔

یہ تو دل نے کہا۔ باقی زبان یہی الفاظ ادا کرتی رہی کہ محض آپ کی عزت افزائی ہے میں کس لائق ہوں۔ مجھے تو لکھتے ہوئے شرم آرہی تھی کہ آپ حضرات اہل زبان کے مقابلہ میں زبان کیا کھولوں۔"

بس اس روز سے ثاقب صاحب مہربان ہو گئے لکھنؤ کے شاعروں میں عزیز صاحب تو پہلے ہی سے مخلصانہ کرم فرماتے تھے اور وہ تھے بھی طبعاً متواضع و منکسر مزاج محشر صاحب اثر صاحب سے حضرت اکبر الہ آبادی کے طفیل میں سرسری نیاز حاصل ہو گیا تھا۔ صفی صاحب ظریف صاحب اور سب سے بڑھ کر مرزا سوا صاحب بھی عنایت فرماؤں میں تھے۔ ثاقب صا[حب] کا مہربان ہو جانا ان سب سے بڑھ کر تھا۔

اسی صحبت میں خوش ہو کر اپنا کلام بھی زبانی سُنایا۔ غزل کا مطلع ہے اور دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے اندر حسن و عشق کی پوری داستان رنگین سمیٹ لی ہے ؎

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

اور پھر جو ایک شعر پڑھا ظالم نے تڑپا ہی دیا ؎

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

شعر بلا ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے لیکن ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے مضمون کی تص[ویر] بھی کھینچتے جاتے۔ دوسرا مصرعہ جب پڑھا ہے تو آنکھیں ذرا بند کر کے سر کو ایک طرف اس طرح جھکایا اور ہاتھ کو اس کے نیچے اس طرح لائے کہ جیسے سچ مچ تکیہ پر سر رکھ کر سو ہی گئے ہیں۔ اس ہیچ مداں نے شعر کی تکرار اس کثرت سے دوستوں کے سامنے کی اور اپنی تحریروں میں اتنی بار دہرایا کہ اب وہ شعر بے تکلف سب کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے ضرب المثل بن جانیکی صلاحیت اس میں موجود ہی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور یاد کر لیجئے کہ وہ الفاروق کے مصنف تھے اشہر کے شیعہ اہل سخن وارباب ادب سے تعلقات اچھے خاصے رکھتے تھے۔ بلکہ عزیز صاحب کا تعارف اس خاکسار سے انھیں نے کرایا تھا۔ ثاقب صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے ۱۹۱۳ء میں ہنگامہ مسجد کان پور پیش آیا۔ پولیس نے مجمع پر گولی چلائی اور بڑے بوڑھوں کے ساتھ کچھ لڑکے بھی شہید ہوئے۔ شبلی نے متاثر ہو کر ایک ماتمی نظم کہی اس میں اس موقع پر ان مقتول لڑکوں کے والدین رات کو ان کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں اور ان کے قتل سے بے خبر ہیں ایک مصرعہ تھا ؎

یہ لڑکے ہیں بہت جلد انکو سو جانے کی عادت ہے،

نظم ثاقب کو سنائی، ثاقب نے داد دی مگر یہ کہا کہ یہ مصرعہ لکھنؤ کی زبان میں نہیں، مولانا نے کہا بسم اللہ اصلاح ارشاد ہو۔ بولے یوں ہو جائے تو بہتر ہے ع

یہ بچے ہیں سویرے ان کو سو رہنے کی عادت ہے،

مولانا نے انصاف پسندی کے تقاضے سے جو اہل کمال کا خاصہ ہے بے تکلف اس ترمیم کو قبول کر لیا ۔ ثاقب صاحب باشندہ لکھنؤ کے نہیں اکبر آباد (آگرہ) کے تھے لیکن لکھنؤ کی زبان کا جہاں تک تعلق ہے کسی لکھنوی سے نہ ہیٹے تھے نہ پیچھے۔

اس نیاز مند سے حسن ظن آخر تک قائم رکھا کئی سال کا ذکر ہے کہ پہلے خط لکھ کر اور پھر لکھنؤ میں خود مل کر زبانی فرمائش کی کہ دیوان مرتب ہو گیا ہے اس پر مقدمہ تم ہی لکھ سکتے ہو، لکھ دو۔ اب اتنی فرصت کہاں نصیب تھی بہت دب دب کر اور پیچ پیچ کر معذرت کرنی پڑی۔!

افسوس کہ یہ شمع سخن ۲۳ نومبر ۱۹۴۶ء (۲۷ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ یوم جمعہ) گل ہو کر مجلس ادب سونی کر گئی۔

ایک گمنام نامور

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کی اطلاع ہے کہ منشی امیر احمد علوی نے پرسوں شنبہ ۱۸ رمضان مطابق ۳۱ مئی ۵۲ء کو اپنے وطن میں غالباً ۷۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اردو کے ان چند ادیبوں میں تھے جو صحت زبان کی فکر و پرداز رکھتے تھے۔ املا محاورات کی صحت، ترکیبوں کی صحت کے لئے کاوش و اہتمام رکھتے تھے۔ ان بے استاد اہل قلم میں نہ تھے جن کے ہاں کوئی بے طرح ہوا عوام پسند فقرہ ہر عیب اور ہر جہل کا پردہ پوش بن جاتا ہے تاریخ اسلامیات، نقد و ادب پر خاص توجہ تھی۔ تاریخ زوال بنی اسرائیل، سفر سعادت، مثنویات، ابوظفر بہادر شاہ، تاریخ مالوہ اتنی کتابوں کے نام اس وقت یاد پڑ رہے ہیں۔ زبان کا ذوق شروع ہی سے تھا۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے منصبوں پر فائز رہنے کے باوجود خدمت علم و ادب کیلئے بھی برابر وقت نکالتے رہے۔ زیادہ تر اپنے ہی صوبہ میں رہے۔ پھر آخر میں سی۔ پی میں ڈسٹرکٹ ججی کے اختیارات بھی مل گئے تھے۔ اہل کاکوری کی نفاست پسندی اور مہمان نوازی مشہور ہے اور مرحوم ان حیثیات سے پورے کاکوروی تھے حج اتفاق سے اسی سال کرنے گئے جو مدیر صدق کا سنہ حج تھا (۱۹۲۹ء) منیٰ اور مدینہ منورہ میں ساتھ رہنے کے علاوہ واپسی میں جہاز پر بھی رفاقت رہی اور جب اپنا سفرنامہ سفر سعادت کے نام سے مرتب کیا تو اس پر دیباچہ اسی نامہ سیاہ سے لکھوایا۔

صدق ۱۳ جون ۱۹۵۲ء

بڑے گھرے مذہبی تھے۔ آخری سن میں نہیں بلکہ شروع سن میں جو ولولوں اور امنگوں کا زمانہ ہوتا ہے، اور یہ تازہ گریجویٹ تھے اس وقت بھی ادبی بحثوں میں فرنگیت کا مقابلہ اور مشرقیت و اسلامیت کی تائید کرتے رہتے تھے۔ شرافت اور خوش ذوقی کے ایک پیکر مجسم تھے۔ اشتہار بازی اور خودنمائی کے تازہ بہ تازہ (اپ ٹو ڈیٹ) طریقوں سے ناواقف تھے اس لئے وہ شہرت و ناموری حاصل نہ کر سکے جس کے اپنی ادبیت کی بنا پر مستحق تھے اور عمر بھر نسبتۃً گمنام ہی سے رہے۔ اللہ اونچے سے اونچے مرتبہ نصیب کرے۔ سفر آخرت کیلئے رمضان کا ماہ مبارک ملنا خود ایک دلیل مغفرت و مغفوریت کی ہے۔

—— × ×——
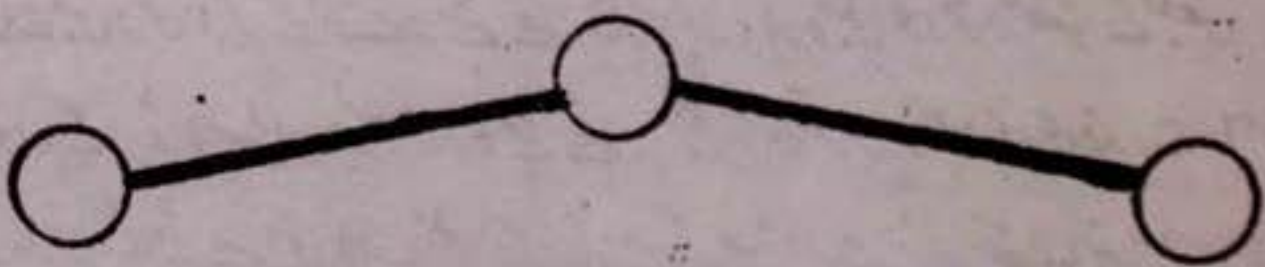
سید علی عباس حسینی

سید علی عباس حسینی کے نام سے صدق کے حلقے والے بہت ہی کم واقف ہونگے۔ ترقی پسندوں کی صف اول کے لکھنے والوں میں تھے۔ لیکن ان میں ترقی پسندی کی کوئی ادا مشکل ہی سے موجود تھی۔ نہ تعلّی و خود ستائی نہ فحش و عریانی، نہ رکاکت و ابتذال اور نہ خدا اور مذہبیت پر چوٹیں۔ اسی ستمبر کے آخر میں ایک طویل علالت کے بعد لکھنؤ میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسانے، افسانچے، ناول متعدد لکھ گئے۔ ایک کتاب اردو ناول نویسی کی تاریخ پر بھی ہے۔ رہنے والے ضلع غازی پور کے قصبہ پارہ کے تھے مدت سے لکھنؤ ہی کو وطن بنا لیا تھا مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ شروع زندگی میں مذہب سے شوخیاں کر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ خود مذہبی ہو گئے تھے۔ اور آخر عمر میں بیشتر مطالعہ قرآن مجید اور تفسیر ہی کا رہ گیا تھا۔ ہر ملاقات میں دینی تذکرے کرتے رہتے تھے۔ غازی پور، بارہ بنکی اور خود لکھنؤ کے بعض اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہ چکے تھے۔ انگریزی تحریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ مدیر صدق سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا تھا۔ اسی رشتہ کا ادب و احترام آج تک قائم رکھے ہوئے تھے۔ امریکی ناول جنسیات و لغویات سے لبریز ہوتے ہیں ان کا وہ بکثرت مطالعہ کرتے رہتے لیکن کمال یہ تھا کہ ان کا چربہ اتارنے میں ان لغویات سے بالکل پاکدامن رہتے۔ بڑے ہی شریف مہذب، شائستہ و نستعلیق تھے۔ لکھنؤ کے شیعہ سنی مجادلہ سے بیزار رہتے۔ صلح کل کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی اشاعت کرتے رہتے۔ حق تعالیٰ عاقبت بخیر

(صدق جدید ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

قمر احمد علیگ مرحوم

بحرآباد (ضلع غازی پور، یو۔پی) سے یہ تاسف انگیز خبر شائع ہوئی کہ حاجی قمر احمد بی۔ اے ایل
ایل بی وکیل اپنے وطن میں ۲ جون (۸ رمضان) کو بعارضہ ضیق النفس وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

علی گڑھ کے شیدائیوں بلکہ فدائیوں میں تھے۔ ابتداءً مضمون علیگیات پر لکھتے رہے
ساتھ ہی وکالت کی پریکٹس بھی۔ سنہ ۲۰ء و سنہ ۲۱ء میں جب تحریک خلافت کا شباب
تو ملک کے سیکڑوں پرجوش وکیلوں کی طرح انھوں نے بھی ترک موالات پر عمل کیا۔
اچھی چلتی ہوئی وکالت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کچھ ہی روز بعد بمبئی جاکر روزنامہ
خلافت کو ہاتھ میں لے لیا۔ خلافت مولانا شوکت علی کی زیر نگرانی تحریک خلافت
ترک موالات کا نقیب خاص اور اس وقت اپنے عروج شباب پر تھا۔ قمر احمد کا قلم
دماغ سالہا سال ملت کی خدمت خلوص کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اپنے سیاسی خیالات
نیشلسٹ تھے لیکن بڑے پختہ مسلمان۔ اپنی اسلامیت کو ہر دوسری چیز پر مقدم
سمجھنے والے علی برادران کے تو خاص مخلصوں اور ارادتمندوں میں تھے۔ خلافت ہی
ایک وفد کے سلسلہ میں زیارت حجاز سے بھی مشرف ہو آئے تھے چہرہ پر داڑھی
نماز کے پابند۔ بمبئی میں رہنے اور ہر طرح کے موقع حاصل ہونے کے باوجود "لیڈری"
شان کے قریب بھی نہ گئے۔ اپنے کو محض خدمت گذار ہی سمجھتے رہے۔ مزاج سلجھا
ہوا۔ غصہ اور تیز زبانی گویا جانتے ہی نہ تھے۔

صدق ۲۵ جون ۱۹۵۲ء

"چار سال ہوئے خیال پیدا ہوا تھا کہ تاریخ تحریک خلافت مرتب ہونا چاہیے
اگر یہ مرتب نہ ہوئی تو مسلمانان ہند کی جدوجہد کا ایک بڑا اسمان نامہ تاریخ میں غیر
مرتب رہ جائے گا۔ ایسی کتاب کے بہترین لکھنے والے وہی ہو سکتے تھے مشیت الہی
کو یہ منظور نہ ہوا۔ رمضان مبارک کا پہلا عشرہ عشرۂ رحمت ہوتا ہے اس کی ۱۰ کو وفات پا
جانا خود دلیل مغفوریت ہے۔

ایک پرانے صحافی کی وفات[۱]

○

مولوی ریاض الرحمٰن خاں شیروانی ایم اے کا مکتوب، دسمبر کا چلا ہوا علی گڑھ سے:
"شب گزشتہ میں مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی نے ۹۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آج
بعد دوپہر تدفین عمل میں آئی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے بہت وضعدار اور شفیق بزرگ تھے۔
مرحوم سید جالب مرحوم کے معاصر تھے اور اردو صحافیوں میں شاید سب سے معمر اہل قلم
اور علیگڈھ کے مشہور شیروانی خاندان کے سب سے محترم اور دیرینہ سال مرد بزرگ رکھے تھے
اوائل میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (ہفتہ وار) کی ادارت محسن الملک و وقار الملک کے زمانہ
میں کی۔ اور اس کے بعد علی گڈھ گزٹ نامی اخبار کی اور تحریک موالات میں اس تحریک کے شدید مخالف
ہو کر قلم میں جان بھی اور زور بھی تھا اور صحافت کے علاوہ رسالہ الایمان اور شاید کچھ اور دینی کتابوں
کے مصنف تھے، اور علاوہ لکھنے پڑھنے کے پریس کے کام اور انتظام میں بھی بڑا سلیقہ اور گہرا
تجربہ رکھتے تھے اور فرض شناسی اور کارگزاری میں تو اپنے نظیر بس آپ ہی تھے اور مزاج

---

[۱] منقول از صدق جدید ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء

شوخی اور چھول اس غضب کی تھی کہ غالب کی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی یاد تازہ کر
کالج یا یونی ورسٹی کے ایک ڈنر میں شریک ہوئے. خاکہ ایک نظم میں کھینچا شوخی کا اندازہ نمونہ کے
شعرے کر لیجیے. ؎

ہر اک مہمان مرغ اڑاتا رہا
مگر ایک میں، گڑ گڑاتا رہا

احتیاط زندگی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ ۹۰ سال کی عمر تک پیدل مسافت اچھی خاصی چل لیتے
اور خط کا جواب بھی پہلی ڈاک سے دیتے تھے۔

معمولات عبادت بھی برابر جاری رکھتے. مغفوریت اسی سے ظاہر ہے کہ تاریخ عین وسط
ن کی پائی اور رات جو ملی وہ جمعہ کے متصل، حج بیت اللہ کی نعمت سے بھی سرفراز ہو
تھے۔

ایک مخلص خصوصی کی وفات[۱]

اردو کے ایک معروف و مقبول اہل قلم صحافی مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی
ندوی، ۲۷ اکتوبر کو لاہور میں وفات پا گئے. انا للہ و انا الیہ راجعون
صحت سالہا سال سے بہت ہی خراب چلی آرہی تھی. آخر وقت موعود نے آلیا. بندہ
اپنے رب و مالک کے حضور میں پہونچ گیا.
خیرآباد (اودھ) کے رہنے والے تھے اور مشہور اردو شاعر ریاض خیرآبادی کے

---

[۱] صدق جدید ۸ر نومبر ۱۹۶۸ء

فوائے۔ تعلیم ندوہ میں پائی اور پھر جامعہ جا کر پڑھے۔ مضمون نگاری کا شوق شر
سے تھا اور دلی تمنا یہ تھی کہ جامعہ ازہر (مصر) جا کر وہاں سے سند علم و فضیلت لائیں
آرزو تو کسی طرح پوری نہ ہو سکی البتہ جامعہ سے نکل کر صحافت کی لائن میں داخل ہو
اور پہلے روزنامہ خلافت (بمبئی) اور پھر کئی دوسرے اخبار و رسالوں میں کام کیا۔ بڑے محنتی مس
اور کارگزار تھے۔ مولانا محمد علی کا زمانہ تو نہ مل پایا۔ البتہ مولانا شوکت علی کے منظور نظ
اور معتمد علیہ رہے۔ پاکستان بننے پر پہلے کراچی گئے اور وہاں سے لاہور منتقل ہو گئے ا
عمر وہاں کے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کاٹ دی۔

ضرورتوں نے بڑا زود نویس بنا دیا۔ ہزار ہزار صفحات لکھ ڈالے معروف و معتب
ناول نویس کی حیثیت سے ہوئے۔ لیکن مولف سیرت محمد علی اور علی برادران کے بھی
اور عربی سے کئی دینی اور غیر دینی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اپنے معاصرین پر ایک
دلچسپ جلد دید و شنید کے نام سے شائع کی اس کا دوسرا ایڈیشن نکالنے کی فکر میں
آخر تک رہے۔ علی برادران سے نسبت عشق رکھتے تھے۔ یتیم بچپن ہی سے ہو گئے تھے۔ تعلیم و
تربیت ایک صاحب عزم ماں نے دی۔ اور یہ بھی ان کے مطیع و منقاد اپنے بڑے بھا
سید عقیل احمد عقیل کی طرح ان مرحومہ کے آخری وقت تک رہے۔

اور مدیر صدق اپنی کیا کہے۔ اس کے تو خصوصی مخلصوں بلکہ فدائیوں میں تھے۔
تعلقات کی عمر ۴۰۔۴۲ سال کی ہو چکی تھی۔ ندوہ میں پڑھ رہے تھے جب ہی سے غیر معمولی
حسن ظن پیدا کر لیا تھا جو زندگی بھر قائم رہا ـــــ اللہ پاک ان پر رحمت فرمائے

پروفیسر احتشام حسین رضوی مرحوم[1]

○

اُردو پر جو مخلص اپنا جی جان قربان کئے ہوئے ہیں اور اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں، ان میں کوئی احتشام سے بڑھ کر تو کیا ہوتا۔ کوئی ان کے برابر کا، ان کی ٹکر کا نکل آئے تو بھی بڑی بات ہے۔ دعویٰ زبان سے کرنے والے بیشمار ہیں، لیکن میزانِ اخلاص پر پورے اُترنے والے کچھ تھوڑے ہی سے ہیں۔ اور ان چند میں بھی خاص بلکہ یہ کہیے اخص الخواص کہلانے کے قابل جو دو ہی چار ہیں، ان میں ایک وہ مرحوم تھے، جن کی یاد منانے اور ان پر آنسو بہانے ہم سب جمع ہوئے ہیں۔ پرانی ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد والی ہو تو، اور نئی اردو اکیڈمی لکھنؤ والی ہو تو، آل انڈیا انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی ہو تو، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ کا ہو تو، شعبہ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی کا ہو تو، الٰہ آباد یونی ورسٹی کا ہو تو، اردو کا کوئی سا بھی شعبہ یا ادارہ ہو، سرکاری یا غیر سرکاری، سب سے ان کا یکساں تعلق؛ ملک گیر ہو، ریاستی ہو، سب سے ان کا مساوی ربط، وہ ہر ایک کے خادم دنیاز مند، اور پھر یہ تو ان کا اجتماعی سلسلۂ خدمات ہوا۔ رہا شخصی و انفرادی سلسلۂ تعلیم و تصنیف، تدوین و تحقیق یہ سب اس کے علاوہ ماسوا۔ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں صفحے کتابوں اور مقالوں کے حجم کی صورت میں کس نے ۳۰ سال کی مدت میں تیار کر ڈالے، تنقید کے، تاریخ ادب کے اور سفرناموں کے ڈھیر لگا دیے، اُردو کی خدمت بہر عنوان بہر صورت ان ہی مشغلہ رہی،

---

[1] منقول از صدق ۱۹ر جنوری ۱۹۷۳ء۔ تقریر جلسۂ تعزیت لکھنؤ میں ۳۱ر دسمبر ۷۲ء کی شب کو سنائی گئی۔

دھندا، یہی حال، یہی قال، یہی جمال، یہی کمال، اردو میں ناقد تو پہلے بھی بڑے بڑے ہو چکے تھے اور سخن فہم، سخن سنج حالی و شبلی کے سے گزر چکے تھے، لیکن وہ سخن فہمی تمام تر ذوقی و وجدانی تھی، کسی ترکیب کی ندرت پر جھوم اٹھے، کسی فقرے کی دروبست کی نزاکت پر داد کے ساتھ دل دے بیٹھے۔ لیکن تنقید بہ حیثیت فن دور احتشامی سے قبل اردو میں کہاں آئی تھی، تنقید کے اصول و مباحث مغرب سے لا لا کر مشرق کے مدرسوں میں کس نے پھیلائے تھے! یہ نئے نئے رنگ و وضع کے گل و بوٹے شبستان مشرق میں کس نے کھلائے تھے۔ یہ نت نئے سبق اپنے ہم وطنوں کو کس نے پڑھائے تھے۔؟

اردو کا مورخ ادب اس موضوع پر جب قلم اٹھائے گا اور اس فن کے بانیوں کا نام گنائے گا تو اولیت والوں میں نام اس عالیشان کا، والا احتشام کا ضرور آئے گا۔ حضرت رومی نے اپنی مثنوی میں عشق کو مخاطب کر کے فرمایا ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما

اے تو افلاطون و جالینوس ما

اب عشق کے بجائے اردو زبان یا اردو زبان کے عشق کو رکھ لیجیے۔ اور اس کلام کو احتشام مرحوم کی روح کی زبان پر بلا تکلف جاری کر دا دیجیے۔

مرحوم نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں گزارا، اور اس کے ذریعہ سے اردو اور اردو پسندی کو جتنا پھیلایا، خصوصاً اردو بیزاری کے عین زمانہ میں، وہ بھی انھیں کا حصّہ تھا۔ اور پھر اب کئی سال سے یہی جہاد لطیف ان کا الہ آباد یونیورسٹی کے ذریعہ سے جاری تھا۔ یہ بھی انھیں کا حصّہ تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں تو اپنے قابل فخر شاگرد انھوں نے چھوڑے ہیں۔ خالق کائنات کی مشیت اور مصلحتوں میں کون

دم مار سکتا ہے، ورنہ اس درجہ دفعتہً اور ناگہانی اس چشمۂ فیض کی بندش ہم بندوں کی سمجھ میں تو آتی نہیں۔ بے ادبی نہ سمجھی جائے تو دل جلا ہوا اور پکا ہوا ہر اردو والے کا یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اردو کی مخالفت نکو بیتی قوتوں نے موت سے ساز باز کر لیا ہے اور اردو کے سورما سے یوں میدان صاف کر دیا۔

میری اس تقریر حقیر کے بعد آپ کے مجمعے میں تقریریں احتشام کے فن پر آئیں گی اور آپ ان فنی تقریروں کے تجزیہ اور تحلیل سے لطف اٹھائیں گے، اس حقیر کو تو اجازت دیجیے کہ مرحوم کی ذاتی صفات سے متعلق اپنے تاثرات و تجربات بھی کچھ عرض کر دے۔ ایسی بزرگ دانشت، ایسا انکسار، ایسی لطافت طبع، ایسی سلامت روی، ایسی خوشگوار رواداری بلکہ میں کہوں گا کہ ایسی بے نفسی اور مشرقی اخلاق کی جامعیت کم ہی کہیں دیکھنے میں آئی ہے۔ سن میں مجھ سے چھوٹے ضرور تھے لیکن برتاوے میں اپنے کو چھوٹے سے چھوٹا دکھاتے تھے۔ کبھی کوئی نا ملائم یا غصہ کا لفظ ان کی زبان سے آتے تو میں نے کبھی سنا نہیں۔ یہ اختلاف چاہے وہ سیاسی ہو، یا مذہبی یا ادبی ایسی حکمت و خوشگواری کے ساتھ وہ حلم و متانت سے ٹال جاتے کہ انانیت منہ تکنے لگتی اور خودداری عش عش کر کے رہ جاتی۔ ضابطہ سے تعلق تو شاید ترقی پسندوں سے رہا کیا لیکن سابقہ میں پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ ترقی پسند ہیں، یا مجھ جیسے تنزل پسند دقیانوسی شاعروں کے کلام پر نہ مضحکہ، نہ ان کے کسی دیوان کے مطالعہ سے بے نیازی۔ نہ استادوں سے مقابلے کے دم خم نہ اپنی تعلیوں کی رجز خوانیاں!

نہ ترقی پسندی کی ہمہمہ کا کوئی نشان نہ اس کے طنطنہ کی شان، ایک بار کیا ہوا کہ ریڈیائی یا نشری مکالمہ کے سلسلہ میں نوبت شرکت کی آئی اور مجھ سے انٹرویو لینے آئے۔ میرے ایک جواب میں ریڈیو والوں کو کچھ کلام ہوا۔ مجھے یقین کہ میرا جواب سرے سے رد ہوا لیکن واہ ری شرافت کہ احتشام صاحب نے خود اپنا سوال ہی اٹھا

واپس لے لیا۔ اور کمال بالائے کمال یہ کہ اس امکان بدمزگی پر بھی شرمندہ اور معذرت خواہ! ـــــــ اسے نفس کی شرافت کیوں کہئے! کرامت کیوں نہ کہئے۔!

اس طرح کے نازک موقع دو ایک کمیٹیوں میں بھی پیش آئے مگر وہ ہر موقع پر اپنی بڑائی اور برتری ہی کا نشان چھوڑ گئے۔

اس عالی کردار اور اس بے نفسی کے نمونے اگر عام ہو جائیں تو دنیا خصوصاً دنیائے ادب سے رنجش و فساد کے امکانات بھی عنقا ہو جائیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مرحوم کو یہ احساس بھی کبھی نہ ہوا ہو گا کہ انھیں کسی سے اختلاف بھی ہے۔ ایسی پاکیزہ صفات ہستیاں خصوصاً ادیبوں میں اب کہاں دیکھنے کو ملیں گی۔!

ایک مردِ مومن کی وفات[1]

○

آہ عبدالحمید خاں بی اے (عثمانیہ) ایڈیٹر "الہدیٰ" (حیدرآباد دکن) رمضان کے ماہِ مبارک
کی دوسری تاریخ تھی اور پہلا جمعہ (۸ جون ۵۱ء) کہ صبح کے وقت مردِ مجاہد وطن سے دور
اورنگ آباد میں ایک طویل اور صبر آزما علالت کے بعد اپنے مالک و مولا کے حضور میں پہونچ گیا۔ انا
للہ وانا الیہ راجعون۔

بڑے جری و دلیر اور جذبۂ اسلامیت اور حق گوئی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔
مدتوں دکن کے مشہور اسلامی روزنامہ "رہبرِ دکن" میں گمنام کام کرتے رہے اور ستمبر ۴۸ء
کے انقلابِ دکن کے اپنا ذاتی ہفتہ وار الہدیٰ نکالا۔ اور دنیا کو دکھایا کہ مردِ مومن کی زبان
ہر ممکن خطرہ کے باوجود خود اظہارِ حق میں کیتنی بیباک رہ سکتی ہے۔ یہ وقت وہ تھا کہ اچھے اچھوں
کی ہمت جواب دے چکی تھی اور پرانے آزمودہ کاروں کے چھکے چھوٹ چکے تھے لیکن عبدالحمید
خاں کے لئے معلوم ہوتا تھا کہ زمین و آسمان ہی کوئی دوسرے ہیں۔ اسی قلندرانہ بانکپن سے
بدستور لکھتے رہے جب تک وفات سے چند ہفتے قبل، کچھ تو علالت اور کچھ مالی مشکلات کے
باعث پرچہ بند کرنے پر مجبور نہ ہوگئے۔ جب تک لکھا قوتِ ایمانی کی اس جرأت و ہمت سے
لکھا کہ کم از کم صدق کے ایڈیٹر کو تو رشک آگیا۔

عمر بھی کیا پائی زیادہ سے زیادہ پچاس کے ہوں گے۔ سنہ جب ابتداءً ۲۵ء کے

---

[1] ۲۲ جون ۵۱ء

شروع میں لکھا ہے یہ اسی وقت جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے اور سچ کے بڑے ہی قدر بڑھانے والوں
میں تھے۔ مجھ سے مراسلت اسی زمانہ سے شروع کر دی اور اگست ۴۵ء میں جب میرا جانا
حیدرآباد کا ہوا تو آ کر بڑی محبت بڑے تپاک بڑی عقیدت سے ملے۔ ان کے متعدد مراسلے بھی
اسی زمانہ میں نام سے یا گمنام سچ میں نکلے۔ طبیعت کو کشف گوئی اور اشراقیت سے خاصی مناسبت
تھی اکثر عزیزوں دوستوں کی موت کا علم ان کے وجدان کو پیشتر سے ہو جاتا اور خواب
میں بھی عجیب عجیب پیش بینیاں کرتے تھے۔ اپنے حسن ظن اور (تمام تر غلط حسن ظن) کی بنا پر
ان اسرار کا حل مجھ جیسے ناآشنائے فن سے چاہا کرتے۔ اگر اس زمانے کے ان کے خطوط
میرے ذخیرے میں کہیں دبے پڑے ہوئے نکل آئے تو ان کا مطالعہ بجائے خود بہت دلچسپ
ہو گا۔

خط وکتابت موقوف ہو گئی اور برسوں ان کا کچھ پتہ نہ چلا ۵۶ء یا ۵۷ء میں از خود انکی
یاد بہت آنے لگی اور طبیعت میں تقاضہ ان کے دریافت حال کا پیدا ہوا یہ شاید اسی اشراقیت کا
اثر تھا یا کیا کہ بے نشان وگمان عین اس وقت ان کا ایک خط خوب مفصل موصول ہو گیا۔
اور اس کے بعد سے مراسلت ہر دو چار مہینہ کے وقفہ کے ساتھ ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ ادھر تک جاری
رہی۔ آخری خط میں اپنی علالت اور پرچہ کے التواء کی عارضی کی اطلاع دی تھی اس دور کے خطوط
اگر سب چھاپ دیئے جائیں تو حیدرآبادی مسلمانوں کی شدید مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر نظر دل
کے سامنے آ جائے۔۔ بعض خطوط کے اقتباسات صدق میں مختلف عنوانات کے ماتحت نقل ہوتے
بھی رہے ہیں۔ جمعہ کا دن رمضان کا مہینہ تپ کہنہ کا مرض پردیس کی موت رحمت و مغفرت
کے اتنے سامان اس مرد مومن کے لئے نہ رکھے ہوتے تو اور کس کے لئے ہوتے اللہ اسے
ان نعمتوں سے سرفراز فرمائے جو بہشتیوں سرفروشوں اور دین کے مجاہدوں کے لئے مخصوص
ہیں۔!

ظفرالملکؒ مرحوم[1]

ظفرالملک اور عبدالماجد ایک زمانہ تک (اس کی مدت کئی سال تک قائم رہی) ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم رہے یا کم از کم دوسروں کی نگاہ میں سمجھے گئے۔ ایک قیدِ عنصری سے گویا ایک ہی جھٹکے میں آزاد ہو کر جوارِ رحمت میں پہونچ گیا۔ دوسرا اپنے وقتِ موعود کے انتظار میں ہے۔
آج ان کا نام آنے سے ۳۶، ۳۷ سال کی کیسی کیسی پرانی باتوں کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ اصل نام اسحاق علی علوی تھا۔ ظفرالملک غالباً تاریخی نام ہے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں جب الناظر نکالا تو ایڈیٹری میں نام ظفرالملک کا ہوتا تھا اور بحیثیت پبلشر کے اسحاق علی چھپتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ الگ الگ دو شخصیتیں ہیں اور اس وقت کے آئینِ صحافت میں یہ معیوب بھی نہ تھا۔ ناموری اسی شاندار نام سے

---

[1] صدق ۲۸ر فروری سنہ ۱۹۴۷ء

حاصل ہوئی گئی اور اس پرانے نام کا نشان بھی مٹ گیا ——— جب برما، ہانگ کانگ وغیرہ مشرقی
ایشیا کی لمبی سیاحی کے بعد وطن واپس آئے ہیں تو بالکل صاحب بہادر بنے تھے۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس
منہ میں سگریٹ داڑھی کا کیا ذکر۔ پہلی ملاقات مولانا شبلی کے ہاں مولانا ابوالکلام کے مواجہ میں ہوئی
ان کا سن ۳۰-۳۲ سال؛ میں سترہ سال کا کالجی طالب علم ۔ چند روز بعد میں نے طالب علمی کے
پردہ میں الناظر کے لئے علمی مقالات شروع کر دیئے یہ رفاقت مدتوں رہی میں لا مذہب تھا۔ وہ رفتہ
رفتہ سخت قسم کے مذہبی ہو گئے۔ چہرے پر داڑھی، وضع بھی خالص مشرقی، بیعت بھی مولانا حسین القد
قدس سرہ سے کرلی۔

———— ⁂ ———— ⁂ ————

دوسرا لمبا ساتھ جنوری ۱۹۲۵ء میں سچ کے اجراء سے شروع ہوا۔ پہلے وہ ایڈیٹر رہے
اور میں مقالہ نگار خصوصی، کچھ ہی روز بعد وہ منیجر اور میں ایڈیٹر یہ تعلق ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ ۱۹۰۵
کے آخر میں نئی اودھ خلافت کمیٹی بنائی گئی، بنانے والے وہی تھے نام کے لئے صدارت پر مجھے بٹھاد
گیا۔ وسط ۱۹۲۷ء سے مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد دہلی کی ذمہ داری مشترک ہم دونوں
لے لی، وہ منیجر اور میں نگراں اڈیٹر ۔ لیجئے حقیقت کا ذکر تو بھول ہی گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ہفتہ وار
دار حقیقت ہم دونوں نے مل کر نکالا اور تقسیم یہاں بھی رہی۔ وہ منیجر اور میں صیغہ ادارت کا ذمہ دار
کچھ روز بعد ہم دونوں علاحدہ ہو گئے اور عزیزی انیس احمد صاحب کے ہاتھوں جا کر روزنامہ
ہو گیا ۔ غرض ساتھ میرا ان کا ہمیشہ رہا، کم کسی کا رہا ہوگا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے
واقفیت کے موقع مجھے رہے بجز ان کے قریب ترین عزیزوں کے شاید کسی کو بھی نہ رہے ہوں گے۔
اوصاف بہت سے تھے اور سو وصفوں کا وصف یہ تھا کہ دھن کے بڑے پکے تھے، اپنے عقائد
دین میں بھی بڑے راسخ تھے۔ عمر کے آخری چند سال مدح صحابہؓ کی حمایت و ترویج میں بسر کئے
اب یہی اوڑھنا بچھونا رہ گیا تھا اسی میں جئے اور اسی میں دنیا سے رخصت ہوئے اور عجب
نہیں جو تنہا یہی عشق صحابہ ہی مغفرت بن گیا ہو۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

ہوش یار جنگ بلگرامیؒ

مرحوم سے میری ملاقات اس وقت کی ہے جب وہ نہ تو نواب تھے اور نہ خطاب یافتہ محض ہوش بلگرامی تھے اور ایک ماہ نامہ ذخیرہ کے ایڈیٹر۔ یہ ذکر ۱۹۱۷ء کا ہے جب میں پہلی بار حیدرآباد آیا۔ تحریری ملاقات اس سے دو سال قبل شروع ہو چکی تھی۔

ملاقات بہت جلد بڑھ کر دوستی تک پہونچ گئی اور یہ نتیجہ تمام تر انھیں کی ملنساری اور یارباشی کا تھا۔ ورنہ میں تو اس وقت تک اپنی خشک مزاجی اور کم آمیزی کے لئے مشہور تھا۔ کبھی اپنے ہاں کھانے پر بلاتے اور دھوم دھام سے دعوت کرتے۔ کبھی شبرات، کبھی عید وغیرہ کا حصّہ بھیجے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد کے مصاحبوں میں تھے جن کی ادب نوازی علم پروری اور فیاضیاں زبان زد عام ہیں۔ اپنے "دور جاہلیت" میں میں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ نام سے نہیں گمنام۔ ایک روز ہوش اس کے دو نسخے لے کر مہاراجہ کی خدمت میں گئے اور اصل قیمت ڈیڑھ دھیلوں کے بجائے دو اشرفیاں لے کر آئے۔ اشرفی اس وقت ۲۶ روپے کی ہوتی تھی۔

کچھ ہی روز بعد ان کا ستارہ گردش میں آیا، حیدرآباد سے ہٹنا پڑا، بھوپال وغیرہ ہوتے ہوئے رامپور میں کئی سال جم کر رہے۔ میں بھی لکھنؤ آ چکا تھا۔ ان سے پینگ بڑھتے رہے۔ غالباً ۳۲ء تھا کہ مجھے اپنے صرف سے حیدرآباد لے گئے اور راستے بھر بڑی اولوالعزمی کا ثبوت دیتے رہے۔ حیدرآباد جب دوبارہ پہونچے ہیں تو دنیوی عروج خوب حاصل کیا۔ انکی زندگی

یکم دسمبر ۵۵ءؒ

دنیوی اتار چڑھاؤ کا ایک مرقع بھی ۔لیکن میرے ساتھ اپنی زندگی کے ہر دور میں یکساں برتاؤ، مہر و محبت، لطف و اخلاص ہی کا رکھا مذہبی اختلافات سے قطع نظر سیاسی روش بھی ان کی مجھ سے جُدا گانہ تھی۔ ادبی میدان میں بھی پوری ہم آہنگی نہ تھی ـــــ دوستی ان سب کے باوجود قائم بلکہ ترقی پذیر۔ اسے ان کی شرافت اور وضعداری کا اعجاز نہ کہئے تو اور کیا کہئے ـــ !

امین الملک سر مرزا کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں تو انھوں نے کمال ہی کیا۔ میرا وظیفہ تصنیفی ۱۹ سے ایک حال پر چلا آرہا تھا۔ ۴۶ء میں انھیں نے تحریک کرکے ان کو گویا مضاعف کر دیا ـــــ اور یہ سلوک تنہا میرے ہی ساتھ نہ تھا۔ کئی سال قبل مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے ذاتی وظیفہ حیدرآباد سے جاری کرا چکے تھے۔

صاحبِ قلم تھے اور شاعر بھی اور ان کی مثنوی "طوفانِ محبت" تو پڑھنے کے قابل ہے۔ آخری کتاب مشاہدات ہنگامہ خیز کتاب ہے جس کے موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے اس پر یوصدق کے لئے کئی ہفتے ہوئے لکھا جا چکا ہے اس کے بعض پہلوؤں پر مرحوم سے مراسلت جاری تھی۔

مذہباً شیعہ اور روشن خیال شیعہ تھے لیکن عماد الملک سید حسین اور سید علی اور دوسرے بلگرامیوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے اس لئے علماء اہلسنت سے بھی دل کھول کر ملتے اور ان کی پوری قدر کرتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا مناظر احسن گیلانی دونوں سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور ان کے بعد مولانا عبدالباری ندوی سے بھی ـــــ جس نے اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ حسن سلوک کا مسلسل برتاؤ جاری رکھا اور جو اس کی توحید کی گواہی اور اس کے رسول کی تصدیق پر بہرحال زندہ رہا۔ اس کے ساتھ اگر آج تمام تر عفو و کرم کا معاملہ ہو رہا ہو تو کوئی اس پر حیرت کیوں کرے؟ ۔

چودھری محمد علیؒ مرحوم

○

زندہ دلی، شگفتگی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، اگر مجسم ہو سکتیں تو عجب نہیں کہ قالب انھیں مرحوم کا اختیار کرتیں اور جو کہیں یہ چودھری صاحب یونانیوں کے دور شباب میں پیدا ہو گئے ہوتے تو ہو نہ ہو یہ دیوتا ظرافت تفنن و انبساط کے، مان لئے جاتے اور بے تکلف ان کی پوجا چل پڑتی! ــــ وہ دلّوی بس نام کے تھے، ورنہ بول چال، چال ڈھال، ٹھاٹھ باٹ کے آئینہ میں جیتے جاگتے لکھنوی! وہی آن، وہی شان، وہی لوچ وہی چہل بل لکھنے ہی میں نہیں بولنے میں بھی اور علم مجلس کے تو جیسے بادشاہ تھے۔

بوڑھوں میں بیٹھے تو سنجیدہ و حکیم، جوانوں میں آنکلے تو سرمست و ظریف، بچوں میں گھر گئے تو کھلنڈرے۔ ادیب ہوں کہ طبیب، شاعر ہوں کہ اہل حرفہ، مولوی ہوں کہ مشائخ کسی کی بھی مجلس میں گزر ہو جائے مہر مجلسی ان کے لئے رکھی تھی!

ناول اور افسانے کئی ایک لکھے اتالیق بی بی شائد سب سے پہلی کتاب ہے، شاید سرؔ صاحب کی فرمائش پر لکھی ہوئی۔ ایک اور کتاب آخری زمانہ میں کشکول فقیر محمد علی شاہ کے نام سے نکلی تھی۔ ایک محدود حلقہ کے اندر خوب قدر ہوئی۔ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، شہرت عام نصیب میں نہ تھی نامور ہو کر بھی گمنام ہی رہے! ــــ جنسیات کے ماہر تھے شوائبات کے نہیں، قلم کی شرافت کا کمال یہ ہے کہ ہر ناگفتہ بہ کو پیش کرتے وقت گفتہ بہ بنا دیتے

دسمبر ۵۹ء

ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب (کتاب کیوں کتیا کہیے) پردے کی بات ہے اس میں شریف بہو بیٹیوں سے وہ باتیں کہہ گئے ہیں کہ جو کوئی رازدار سہیلی ہی کہہ سکتی ہے اور وہ بھی کان میں —— پڑھے ہوئے لکھنؤ کے مشہور تعلقہ داروں کے اسکول کالون اسکول کے تھے۔ انگریزی انگریزوں سے پڑھی اور سیکھی۔ انھیں کے لب و لہجہ میں خوب فراٹے سے بولتے بمطالعہ اپنی مشرقی چیزوں کا خوب کیا اور انگریزی میں دلدادہ برنارڈ شاہ، سمرسٹ مام، ٹیگور اور خلیل جبران کے رہے۔ ہاتھ پیر کے اچھے تھے اور رنگ خوب گورا چٹا جوانی میں سوٹ بوٹ پہن لیے پیدائشی انگریز لگنے لگتے —— گہرے مذہبی آخیر عمر میں تو خیر ہو ہی گئے تھے اور آخرت کا نام آتے ہی خشیت سے لرز اٹھتے مذہب سے باغی عمر کے کسی دور میں بھی نہیں رہے۔

تعلقہ دار تھے ایک مدت تک بڑے عیش و عشرت سے بسر کی اپنی رعایا اور پرجا سے اس وقت بھی مل جل کر رہے۔ پیدائش امامیہ خاندان میں ہوئی۔ لیکن جب نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور تحقیق مسائل کا شوق تو اچھے بجائے شیعہ کے صرف مسلم کہلانے لگے۔ اہلسنت سے تعلقات یوں بھی بہت گہرے تھے۔ شادیاں متعدد کیں اکثر اہل سنت ہی کے ہاں۔ میرا ساتھ ۱۹۲۹ء میں سفر حج میں رہا۔ میں نے عبادت کرتے ہی نہیں، عبادت میں اس منصوڈ کو روتے بھی دیکھا۔ ایک ہی جہاز سے گئے ایک ہی سے واپس آئے۔ بمبئی میں، مدینہ میں، مکہ میں ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ واپسی میں ریل پر بھی نمازیں پڑھیں اپنے امامیہ طریقے پر لیکن ہم اہل سنت کی جماعت میں شریک ہو کر اور سنی امام کے پیچھے اور صرف وہیں نہیں دلی اور دریاباد میں بھی —— ایک کتاب میرا مذہب کے نام سے لکھی ہے اس میں اپنے مصالحانہ عقائد کی شرح و ترجمانی کی ہے۔

مولانا ابوالکلام اپنی جوانی کے زمانہ میں جیسے شوخ، طرار زبان آور اور (ان کے معتقدین سے دست بستہ معذرت کے ساتھ) "فقرے باز" تھے۔ اس کا اندازہ بھی جبد میں دیکھنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔ بات کرنا مشکل تھی۔ ابھی اسے بنایا۔ ابھی اس پر فقرہ چست

کیا کس کی مجال تھی جو ان سے ٹکر لے سکے ۔ ۱۹۴۲ء میں اس خاکسار نے اپنے یہاں خاتون منزل لکھنو میں مدعو کیا تو خیال آیا کہ مولانا کے مسلسل وار کون برداشت کرے گا ۔ اسلئے چودھری صاحب کو پکڑ بلا لیا —— جوڑ آخر تک کچھ برابر ہی رہی ۔

ہنسی کی عمر آخر ختم ہوئی اور فالج میں مبتلا ہونے کے بعد ہنسوڑ نے اب مستقل رونا شروع کیا اور گریہ وزاری خوف آخرت سے ! فرنگی محلی ، ندوی ، کسی قسم کی بھی مذہبی شخصیت کو جب پا جاتے رو رو کر اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ لیتے اور اس کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھتے اور یہ مبارک کیفیت ایک دو دن نہیں مدتوں رہی ؎

اے خنک چشمے کہ آن گریانِ اوست

اے خنک قلبے کہ آن بریانِ اوست

یہاں تک کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کو جمعرات کا دن آگیا ۔ ۱۱ بجے دن سے طبیعت یک بہ یک زیادہ خراب ہوگئی ۔ نماز ظہر لیٹے لیٹے ادا کی پھر کبھی درود شریف پڑھتے کبھی اللہ اللہ کہتے ۔ ½۱ بجے کا وقت آگیا اور پھر درود شریف پڑھا اور اللہ اللہ کہا اور اسی پر روح پرواز کر گئی —— تدفین شب جمعہ میں ہوئی ۔ نماز حسب وصیت دو بار پڑھی گئی ۔ ایک بار شیعوں نے پڑھی ، ایک بار سنیوں نے ۔ اور نمازوں میں شرکت بہت بڑی جماعت نے کی —— اللہ بال بال مغفرت فرمائے ۔

~~~~~~
~~~~~~

حمید نظامی مرحومؒ

○

پاکستان میں تو خیر پڑھے لکھوں میں کون ایسا ملے گا جو نوائے وقت لاہور سے واقف نہو۔ ہندوستان میں بھی جو لوگ زیادہ اخبار بین ہیں۔ ان کی بھی بڑی تعداد نوائے وقت سے صورت آشنا اگر نہیں تو نام آشنا تو ضرور ہی ہے ـــــ حمید نظامی اسی مشہور و معروف روزنامہ کے ایڈیٹر کا نام تھا جس نے اپنے کو چھپایا اور اپنے پرچہ کو چمکایا۔

۲۶ فروری (۲۰ رمضان) صبح سات بجے کام کے لئے میز پر بیٹھا ہی تھا کہ دفتر نوائے وقت کا تار پہنچا کہ ۲۵ کو حمید نظامی عارضہ قلب میں دنیا سے رخصت ہو گئے! انا للہ و انا الیہ راجعون ـــــ یا الٰہی یہ کیا غضب ہو گیا! خبر بالکل اچانک ملی۔ نظر کے سامنے اس توانائی مجسم پیکر عمل کی صورت پھر گئی۔ ہم دور افتادوں کو کوئی اطلاع معمولی سی بیماری کی بھی اس سے قبل نہیں پہونچ سکی تھی۔ دفتر والوں نے میرے اور مرحوم کے مخلصانہ تعلقات کا صحیح اندازہ کر کے مجھے فوراً ہی مطلع کر دینا ضروری سمجھا۔ انتقال ۱۲ بجے سے کچھ قبل ہوا۔ تار اسی وقت کی ساری مصروفیت اور پریشان خاطری کے باوجود ۲ بجے کے کچھ بعد روانہ ہو گیا۔

خبر پر یقین کرنے کو دل نہ چاہا، نہ دماغ اس پر آمادہ ہوا، تار پڑھا اور پھر پڑھا جب کوئی گنجائش تار کے مضمون کے جھٹلانے کی نہ رہی تو سناٹے میں آ کر سر پکڑ کر رہ گیا ـــــ مشیت کے فیصلہ پر کس کو دم مارنے کی مجال ہے؟ ۴۳، ۴۴ سال کا سن کوئی مرنے کا سن ہوتا ہے! اور مرد کے لئے تو کہنا چاہیے کہ ابھی جوانی ہی تھی۔ ادھر استحکام پاکستان کے لئے کتنی

(صدق جدید ۹ر مارچ ۱۹۶۲ء)

شدید ضرورت ایسے ہی بے لوث و متوازن رہنما اور جوش و ہوش کے جامع صحافی کی تھی! ۔۔۔ ایک طرف یہ سوچ اور فکر جاری تھی دوسری طرف اضطرار اور بے اختیاری کے عالم میں مرحوم کی بال بال مغفرت اور بلندی مراتب کے لئے دعائیں بھی جاری تھیں۔!

اپنی زندگی میں صحافی خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے۔ گاندھی جی، محمد علی اور ابوالکلام کو اس صف میں نہ لایئے یہ لوگ اصلاً و مستقلاً لیڈر تھے۔ صحافت اُن کے یہاں محض ضمنی و ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ پیشہ ور صحافیوں کو عموماً قلم کا تاجر ہی پایا۔ حمید نظامی اس کلیہ میں استثناء کی ایک روشن مثال تھے۔ صحافت ان کے یہاں پیشہ تھا تجارت نہ تھی۔ ایک خدمت تھی۔ زندگی کا ایک مشن تھا ایک طریقہ عبادت تھا۔ ملّت کی بالخصوص تعمیری خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ بغیر کسی کی خوشامد کئے ہوئے، بغیر کسی کی خوشامد میں آئے ہوئے، بغیر کسی کے دباؤ میں آئے ہوئے، بغیر کسی پر اپنا دباؤ ڈالے ہوئے، وہ ایک زندہ ضمیر کے ساتھ اسی خدمت میں لگے رہے۔ "سنسنی خیزی" کے فن سے نا آشنا تھے۔ شریفوں کی پگڑی اچھالنا ان کے قلم نے جانا ہی نہیں۔ خود شریف النفس تھے۔ شرافت پسند تھے۔ شرافت کی قدر و عزت ان کی نظر میں تھی۔ اپنی قلمی صلاحیت کو دین و ملت و ملک کی خدمت کے لئے وقف رکھا نہ زبردست سے ڈرے نہ زیردست کو ڈرایا۔ کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، کمتر ہی صحافی اس معیار پر اتریں گے۔

اپنی ذات کے اچھالنے، چمکانے سے بیگانہ تھے۔ بڑی سے بڑی کمیٹیوں، مجلسوں تک رسائی رہی یورپ گئے امریکہ گئے، جاپان گئے۔ پرچہ پڑھنے والوں کو اس کا پتہ بھی نہ چلنے دیا اپنی شخصیت نوائے وقت کے پردے میں تمام تر گم کر دیا تھا۔ اس ظرف اور اس بے نفسی کی مثالیں بس برطانیہ ہی کی اعلیٰ روزانہ صحافت (ٹائمز، مانچسٹر گارجین وغیرہ ہی میں ملتی ہے[1])۔ اسلام پر زندہ رہے؛

---

[1] یہاں ینگ انڈیا، کامریڈ یا الہلال کی مثالیں سامنے نہ لایئے۔ یہ خبر نامے نہ تھے بلکہ روزنامہ جریدے و رسالے تھے۔ شخصی مسلک و مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے۔

اسلامیت پر فخر کرتے رہے لیکن ان کا اسلام تعصب و تنگ نظری کا مرادف ذرا بھی نہ رہا۔ بے تعصبی، فراخدلی، رواداری میں ان کا قلم ہر سیکولر صحافی کو سبق دے سکتا تھا۔ سب و شتم ذاتی طنز و تعریض، غلو و مبالغہ سے اپنا قلم کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ موقع پرستی، ضمیر فروشی کے سمندر کے تلاطم خیز تھپیڑوں کے درمیان دیانت و بیداری ضمیر کا یہ ایک ستون چٹان کی طرح مستحکم کھڑا ہوا تھا۔

صدق اور مدیر صدق کی ذات کے ساتھ جس درجہ کا تعلق اخلاص مرحوم کو تھا۔ اس کی مثالیں بھی زیادہ نہ ملیں گی۔ صدق اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے حق و استحقاق سے کہیں بڑھ کر اس کی صحافی برادری کیا ہندوستان کی کیا پاکستان کی اس پر مہربان رہی ہے۔ لیکن "نوائے وقت" اور صاحب نوائے وقت" کو اس عموم میں ایک مرتبہ خصوصی حاصل رہا ہے۔ اور اس درجہ ارتباط و اختصاص میں اگر کوئی اس کی ہمسری کر سکتا ہے تو وہ حیدر آباد دکن کا رہنمائے دکن (سابق رہبر دکن) ہے کہ اس نے بھی اپنے کالموں میں "نوائے وقت" ہی کی طرح صدق (اور سالِ سچ) کی سچی باتیں اور شذرات کی نقل کا التزام ہر ہفتہ شروع ہی سے رکھا ہے ——

اور ایک راز کی سی بات بھی آج مرحوم کی وفات کے بعد سن لیجئے۔ اپریل ۵۸ء میں جب مجھے کراچی پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ تو راستے میں لاہور بھی پڑا۔ دوستوں نے دعوتیں کیں۔ قیام کی آخری رات جب میں صبح سفر شروع ہو جانے والا تھا۔ تو بڑے پیمانہ پر دعوت اختر علی خاں مرحوم نے دفتر زمیندار میں کی۔ نظامی بھی تھے۔ جب میں رخصت ہو کر سواری پر بیٹھنے لگا تو مرحوم نے چپکے سے ایک بند لفافہ میرے سکریٹری کے ہاتھ میں دیدیا کہ اسے صبح مولانا کو دیدیں۔ میں نے جب لفافہ حیرت کے ساتھ کھولا تو اس میں صدق کی اعانت کے لئے کئی سو کی رقم موجود تھی!

ایسے فہیم مخلص ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتے ہیں!

مجھے بھی مرحوم کی شرافت و اخلاص پر وہ اعتماد تھا، جو کسی عزیز قریب پر ہوتا ہے۔ اسی فروری کے مہینہ میں ایک خط ضلع لاہور کے کسی دیہات سے کسی بڑے شکستہ حال پڑھے لکھے کا آیا۔ اپنی تنگ دستی کی مصیبت بیان کی۔ یہاں سے ان صاحب کی خدمت کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ میں نے مرحوم ہی کو ان صاحب کا پتہ لکھ بھیجا، کہ ان کے حال پر توجہ کر دیجائے مرحوم کی وفات سے کل دس بارہ دن پہلے کی ہی بات ہے۔

رمضان کی موت خوش نصیبوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ اور پھر رمضان کا تیسرا عشرہ شروع ہونے پر۔ اور مرض الموت شروع جمعہ کی صبح سے ہوا! ٹھیک اسی وقت جب سحری کھا کر روزہ کی نیت کر چکے تھے! ـــــــ جا قابل رشک روزہ دار مومن اور اپنے مالک سے اجر بے حساب حاصل کر! مہلت تجھے بہت کم مل رہی ہے۔ بہادر یار جنگ مرحوم بھی اسی سن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، لیکن اس مختصر مدت کو بھی تو نے بہتوں کی لمبی لمبی عمروں پر بھاری رکھا۔ تیری روح خود ہنستی ہوئی شاداں و فرحاں رہے اور دوسروں کو اپنی یاد میں رلاتی تڑپاتی رہے۔!

سالک مرحوم[1]

○

لاہور سے خبر آئی کہ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء (یکشنبہ) کے سہ پہر کو چار بجے لاہور ہی کے نہیں سارے پاکستان کے مشہور و معروف صحافی اور باغ و بہار ادیب و شاعر سالک صاحب حرکت قلب بند ہو جانے سے چند منٹ کے اندر رحلت فرما گئے۔ انا للہ۔ عمر ۶۴-۶۵ سال کی پائی۔

نام عبدالمجید خاں تھا۔ دنیا کے ذہن و حافظہ میں صرف سالک تھے (جیسا کہ ان کے قبل ایک نامور صحافی بجائے سید بشارت علی کے صرف سید جالب دہلوی رہ گئے تھے) تازگی شادابی، شگفتگی اور سالک گویا لازم و ملزم تھے۔ روزنامہ صحافت کی عمر ۳۰ سال کی پائی۔ اور روز بروز مشہور سے مشہور تر ہوتے گئے۔ روزنامہ زمیندار میں فکاہی کالم افکار و حوادث کے مستقل عنوان سے انھیں کی ایجاد تھا۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک عالم ان کا مقلد بن گیا اور فکاہی کالم کسی نہ کسی عنوان سے ہر روزنامہ کے لئے ایک جزو لاینفک بن گیا۔ زمیندار سے الگ ہونے کے بعد اپنے رفیق کار مہر صاحب کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی روزنامہ انقلاب نکالا اور دنیائے صحافت میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کر لیا۔ پابندی کے ساتھ ہر روز شستہ و شریفانہ بذلہ سنجی کرتے رہنا۔ اور پھر اسے سالہا سال تک نباہ لے جانا آسان نہیں۔

---

[1] ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

سالک کی ذہنیت و فطانت نے اسی مشکل کو اپنے لئے آسان کر لیا۔ ظرافت محض لفظی خوش طبعی اور تفریح و تفنن تک محدود نہ تھی۔ سن میں پختگی کے ساتھ ساتھ اس میں حضرت اکبر الہ آبادی کی طرح، معنویت، حکمت و معرفت کی آمیزش بھی برابر ہونے لگی تھی۔

شعر گوئی کی فرصت کم ملی لیکن شاعری جتنی بھی کی معیاری کی۔ زبان پر عبور اس درجہ حاصل تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کی صحبتیں دیکھے ہوئے ہیں۔ شاگرد رسا رامپوری کے تھے جو خود بڑی شوخ اور چلبلی طبیعت کے تھے اور زبان کے ایک ماہر استاد۔

آخر سن کے کئی سال سنجیدہ تصنیف و تالیف میں گزارے اور سیاسی عنوانات کے علاوہ ایک ضخیم کتاب مسلمانوں کی، تمدنی و ثقافتی تاریخ پر لکھ ڈالی۔ صدق و مدیر صدق سے گہرا اور دیرینہ خلوص رکھتے تھے اور حضرت اقبال کے بھی مخصوص نیازمندوں میں سے تھے۔

لاہور میں اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھے ان کی وفات سے لاہور کی ساری علمی ادبی، شعری و اخباری فضا سونی ہو گئی۔

سارے ذہنی کمالات کے ساتھ گہرے مذہبی شخص اور بڑے غیور مسلمان تھے۔ اللہ بال بال مغفرت، رحمت و نوازش سے سرفراز فرمائے۔

~~~
~~~

شوکت تھانوی مرحوم[1]

○

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا الحاق کیسا عجیب سا معلوم ہو رہا ہے گویا اجتماعِ ضدین لیکن بالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا! ــــ زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت پوست کی شکل میں سامنے آ سکتے تو وہ شاید شوکت تھانوی ہی ہوتے اور عجب کیا کہ زندہ دلی و ظرافت کے ایک چھوٹے موٹے دیوتا مان لئے گئے ہوتے! موت کے بس سے اگر کسی کو باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری تخیل کی دنیا میں یہی تھے۔ وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا لوگوں کا دل خوش کرنا تھا، خود ایک خاک کا ڈھیر تھا دوسروں کے لئے سرمایۂ ماتم سامان حسرت وغم!

پرانوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی کہ وہ حیوان ضاحک ہے عجب نہیں کہ انھیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی سے پڑا ہو، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورے میں بے پناہ تھا ــــ انشاء کے لئے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو تو ہمت جواب دے گئی اور پسینہ آنے لگا ــــ یہ فرمائش اگر شوکت تھانوی سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی یہ ہر روز بلاناغہ نئی ہی سناتے رہتے۔ اپنے صیغہ میں اتنا حاضر داغ میں نے دیکھا نہیں۔

---

[1] صدق جدید، ۱۰ مئی سنہ ۱۹۶۳ء

خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے اور تھکن یا ماندگی کا پتہ نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد، آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی۔ دوسروں کو لکھ لکھ کر بھی فیاضی اور اولوالعزمی سے دے دیتے تھے اس کا حساب الگ! اور آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے۔

یہ ہنسوڑپن تمام تر بے مقصد نہ ہوتا بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم و تبلیغ شریعت و شرافت کی ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو عین دین و اخلاق کی بھی! خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے۔ اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم و شرمسار آخر تھانہ بھون ہی کے تو تھے۔

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے:

جب پہلی بار فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے تو مجھے خط میں لکھا "میں ریڈیو سے گاتے گاتے اب فلم میں ناچنے بھی آ گیا ہوں"۔

یہ اعتراف خود سیاہیوں کو دھونے والا اور رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید اودھ اخبار لکھنؤ کے ادارتی عملہ میں کام کیا، پھر لکھنؤ کے دوسرے روزنامہ حق میں آ گئے۔ ایک اپنا رسالہ کائنات کے نام سے نکالا۔ سرپنچ لکھنؤ کے بھی مدیر رہے۔ شہرت کا پہلا قدم "سودیشی ریل" لکھ کر اٹھایا۔ غالباً ۱۹۲۹ء میں! اس کے بعد سے مشہور ہوتے چلے گئے۔ مرعوب نہ "ترقی پسندی" سے ہوتے نہ جدیدیت سے۔ کسی اور رخ سے لکھنؤ ریڈیو میں ان منشی جی کی جانشینی قاضی جی کے حصہ میں آئی اور دونوں کی معصومانہ دل لگیوں نے سامعین کو لوٹ لوٹا دیا —— تھانوی محض نام کے تھے ورنہ اسکولی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ لڑکپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ یہیں گزارا اس لئے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ اور روزمرہ پر عبور رکھنے والے، یہیں کی شستہ، رواں، سلیس، نستعلیق زبان لکھنے والے۔ خدائے آمرزگار لغزشوں کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور مرحوم کو کروٹ

کروٹ جنت نصیب فرمائے عمر شاید قریب ۵۵ کے پائی ہو. مرض (کینسر) سا موذی نصیب ہو اس کی نا قابل بیان اذیتیں خود ہی کتنا بڑا سبب کفارہ ذنوب کا بن گئی ہوں گی. پھر سفر آخرت کے لئے ذی الحجہ کے متبرک عشرۂ اول میں بھی متبرک ترین تاریخ عین یوم الحج کی پائی یہ تاریخ کیا ملی. گویا غیبی بشارت مغفوریت کی ہاتھ آگئی. وما یلقٰہا الا ذو حظٍ عظیم۔

ڈاکٹر و طبیب

طبیب کی موت[1]

صبح تھی ۲۵ر دسمبر کی، اور وقت کوئی ۹ بجے کا، کہ خلقت کا ایک ہجوم موٹروں سے اور گاڑیوں سے اور تانگوں سے اور سائیکلوں سے اُتر کر پیدل رواں نظر آیا، لکھنؤ کے ایک مشہور محلہ کی تنگ گلی میں. محلہ جھوائی ٹولہ، شہر اور صوبہ کا مشہور دار الشفا، دہلی کے بعد طب یونانی کا دوسرا دار الحکومت، مریضوں اور زندگی کے مایوسوں کا قبلۂ اُمید. آج سے نہیں پُشتہا پُشت سے. اس وقت سے کہ جب کسی کے کان میں نام بھی نہیں پڑا تھا، کسی کے ذہن میں تصور بھی نہیں آیا تھا. وکٹوریہ ہاسپٹل کا، کنگ جارج میڈیکل کالج کا![2] ـــــ مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگے رہتے تھے، اور یہی وقت بھی ہوتا تھا. آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا. آج قدم اٹھ رہے تھے افسردگی سے اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے. آج نبض دکھانی نہ تھی. نسخہ لکھانا نہ تھا. خود حکیم صاحب کا جنازہ پڑھنا تھا. قبر میں اُتارنا تھا اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا جاتا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا، تربت پر فاتحہ پڑھنا! ـــــ طبیب موت کے منہ میں چارہ گر قضا کے شکنجہ میں! تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں، میں لاتعداد نظیروں میں ایک اور اضافہ!

* * *

---

[1] صدق ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء

[2] اُس وقت کے دو مشہور اسپتالوں کے نام.

طبیب ابن طبیب، حاذقوں کی اولاد، حاذق کے بیٹے، حاذق کے پوتے شفاء الملک حکیم عبدالحمید لکھنوی، محتاج نہ تعریف، کے نہ تعارف کے، مشہور طبی درس گاہ تکمیل الطب کے روح رواں، اچھی خاصی صحت، سرخ و سفید چہرہ، تندرست بشرہ، ابھی اس مایوس کو دوا پلا رہے ہیں، ابھی اس لب مرگ کو خدا کے حکم سے جلا رہے ہیں کہ یکایک خود بیمار پڑے، ذیابیطیس اور پھر دق، بیمار گئے اور آئے، علاج یہ ہوا اور وہ، اور انجام آخر وہی ہوا جو اس کشمکش کا ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ جو علاج دوسروں کا کر رہا تھا خود اس کا مرض لا علاج نکلا، جو داستان گوئی کے لئے مشہور تھا، پلک جھپکتے ہی خود اس کی زندگی افسانہ بن گئی رہ گئی۔! طب کی کتابیں ازبر کر لینے سے کیا انسان آئی ہوئی گھڑی کے آگے پیچھے کر دینے پر کچھ بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے؟ دواؤں کو پہچان لینے، بیماریوں کا نام جان لینے، مرض کی اصطلاحیں یاد کر لینے سے کیا مرگ و فنا کے قانون کی گرفت ایک ذرہ بھی ہلکی ہو جاتی ہے؟ کاٹھ کی پتلیوں کو کپڑے جس کے چاہے پہنا دیجئے، نام بادشاہ، وزیر، کوتوال، فراش، بہشتی، دربان جو چاہے رکھ دیجئے، قوت ساری کی ساری کل کٹھ پتلی والے کے تار اور اس کی مشیت کے ہاتھ میں ہے، یا زرق برق لباس والی مختلف شاندار ناموں والی کٹھ پتلیاں بھی اس میں کسی درجہ میں شریک ہیں۔ اختیار اور قوت سے متعلق پردے کیسے کیسے پڑے ہوئے ہیں! بچے کس معصومیت کے ساتھ بادشاہ اور وزیر اور کیا کیا ان پتلیوں ہی کو یقین کئے ہوئے ہیں۔!
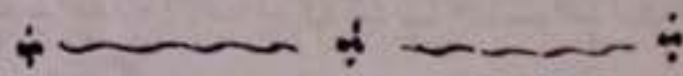
انتقال سے چند روز قبل عیادت کا اتفاق چند منٹ کے لئے ہوا، چہرہ پر نور اور زیادہ آ گیا تھا۔ گھلتے جاتے تھے اور ڈھلتے جاتے تھے۔۔۔ لب برابر ہل رہے تھے نماز کی پابندی ساری عمر کی اور آخر عمر میں حج و زیارت، آخر بے نتیجہ تھوڑے ہی رہ سکتی تھیں؟ اور پھر بالکل آخر میں موت سے کچھ ہی روز قبل ایک ولی کامل کی نظر عنایت و شفقت اور ان کے ہاتھ پر بیعت۔ عیادت کا بڑا وقت اس بیعت پر مبارک باد دینے میں صرف ہوا ——— استغفراللہ و بحمدہٖ

ایسے وقت میں جب کسی نئی معصیت میں مبتلا ہونے کا کوئی موقع ہی نہیں اور مجاہدات اضطراری ہیں کہ ساعت بہ ساعت طے ہوتے جا رہے ہیں! اور مرشد کامل کی توجہ خاص اس پر مستزاد حسن انجام کی پیش خبری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہم اغفر لہ وارحمہ۔

"ڈاکٹر انصاری مرحوم"[1]

آج سے ۲۴ سال قبل ۱۹۱۲ء میں ترکی پر دشمنوں کی یورش تھی جنگ طرابلس ابھی پوری طرح ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ بلقان کی چھوٹی بڑی ساری سلطنتیں طیار ہو کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا نام دنیا نے اول اول اسی وقت سنا اور چند ہی روز میں لوگ پورا نام تو بھول بھال گئے زبانوں پر صرف "ڈاکٹر انصاری" ہی چڑھا رہ محمد علیؒ کی تحریک پر طبی وفد لے کر ترکی گئے، کامریڈ میں ہر ہفتہ ذکر خیر ہوتا رہا۔ محمد علیؒ کی زبا وقلم دونوں ان کی تائید کے لئے وقف تھے۔ وہ دن اور آج، اس بہادر کا قدم، قومیا کے میدان میں پیچھے نہ ہٹا۔ تا آنکہ ۱۰ مئی کو اپنی مدت حیات عالم ناسوت میں پوری کر رب کے حضور میں بلا لئے گئے۔ اللہ نے دولت وافر دی تھی، دست کرم کی فیاضیاں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں، لاکھوں ہی لوگوں کے کھلانے پلانے میں، غریبوں کی مدد میں اٹھا دیئے۔ لق ودق کوٹھی، ایک مستقل مہمان سرا تھی جب دیکھئے مہمانوں سے بھری

---

[1] منقول از صدق ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء

جو صاحب اسٹیشن پر اترے، اس سیدھے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کا رخ کر دیا۔ قوم و ملت کے پیچھے ہر طرح کے دکھ درد اٹھائے۔ آمدنی کا نقصان گوارہ کیا۔ جیل گئے سب کچھ ہوا مگر اپنی آن میں فرق نہ آنے دیا۔ تحریک خلافت کے ستاب میں، خلافت کے لئے خوب خوب کام کئے، جامعہ ملیہ کی سرپرستی آخر دم تک قائم رکھی۔ جوان سے بوڑھے ہوئے لیکن ہمت بدستور جوان ہی رہی۔ قوائے جسمانی ضعیف ہوئے لیکن قومی خدمت گزاری کی قوت اور ولولہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ ۱۱ر مئی کی صبح بھی قیامت کی صبح تھی! صدہا مریض آس لگائے بیٹھے تھے، کہ مسیحائے وقت سے دوائیں گے، نسخہ لکھائیں گے بجائے اس طبیب حاذق کے ٹرین سے طبیب کی لاش آئی! آہ انسانی آرزوؤں کی پامالی! انسان امید کیا لگاتا ہے اور ہو کر کیا رہتا ہے؟ اور آہ! بشری کمالات کی بے حقیقتی جو دوسروں کی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا تھا، اپنے آئے ہوئے وقت کو ایک منٹ کے لئے نہ ٹال سکا! حق تعالیٰ درجہ عالیہ نصیب فرمائیں۔

~~~~

~~~~

ڈاکٹر صاحب

ماہر کے لوگ تو نسبتہً کم واقف تھے لیکن لکھنؤ کے مسلمانوں کو تو یقیناً یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی —— آہ کہ پہلی دفعہ انھیں مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے کیا شخصیت تھی!

ناظم ندوہ تھے اور علم و فضل اور فن طبابت کی طرح کہنا چاہئے کہ یہ نظامت ندوہ بھی موروثی ہی تھی۔ مرحوم کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب (صاحب نزہۃ الخواطر طبیب العائلہ و تذکرہ گل رعنا وغیرہ) ایک فاضل اجل اور سخن سنج بے بدل اور طبیب حاذق ہونے کے ساتھ ناظم ندوہ بھی مدت تک رہے۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (ہم بے تکلف نیازمندوں کی زبان پر صرف ڈاکٹر صاحب) نے فن طب اور علوم دین کی تکمیل کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی ایس سی کر لیا (اور باٹنی یا نباتیات کے مضمون میں غالباً امتیازی نمبر حاصل کئے) اور پھر لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور ہومیوپیتھ طریق علاج میں بھی دستگاہ حاصل کر لی اور مریضوں کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ اللہ نے ہاتھ میں شفا ایسی رکھ دی تھی کہ بس! بار ہا شاید اپنا ذاتی تجربہ ایک آدھ بار کا نہیں بار ہا کا ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف کے وقت ادھر ڈاکٹر صاحب کو دکھایا اور ادھر بیماری رخصت کبھی کبھی دوا کی ایک ہی خوراک سے!

صدق جدید ۱۹ مئی سنہ ۶۱ء

بےنفس، نہایت درجہ خاموش، متین، مسکین، ذی مروت، قانع، متواضع، بے آزار
ور خلوت پسند تھے کم گوئی اور کم سخنی کا اثر پیشہ پر بھی پڑا جب کہ مقابلہ میں بہتوں
ے ہاں طراری اور خوش بیانی خاص جوہر تھے۔ لیکن اس اللہ کے بندے نے اپنی وضع
یں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد حدیث کی تکمیل دیوبند جاکر کی تھی
ور شروع میں خود بھی کچھ دن حدیث کا درس دیتے رہے باقی عبادت الٰہی تو مستقل
ندہ زندگی تھی۔ لمبی گھنی داڑھی دیکھ کر جو تابناک چہرے کے ساتھ اب خود بھی بالکل سفید
و گئی تھی، کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ یہ انگریزی جانتے ہیں، چہ جائیکہ اتنی ڈگریاں پائے
وئے۔

سادگی میں اپنی نظیر آپ تھے اور حلم تو اس درجہ تھا کہ شاید اپنے کسی ملازم پر
بھی آواز نہ بلند کی ہو۔

مسلک اتباع حدیث تھا لیکن حنفیوں سے شیر و شکر اور ایک حنفی ہی شیخ طریقت
ولانا حسین احمد مدنی) کے مرشد۔ سیاسیات سے بے تعلق تھے لیکن محض شیخ کے اتباع
یں ووٹ جاکر نیشنلسٹ بکس میں ڈال آئے ـــــ مطب کی مصروفیت سے جتنا بھی
قت بچتا ندوہ کی خدمت میں صرف کرتے۔ عبادت الٰہی اور خدمت خلق بس یہی دو مشغلے
رہ گئے تھے۔ اور یہی مشغلے ہر سیر و تفریح کے قائم مقام۔

اخلاص ہر ایک کے ساتھ اور پرانے نیازمندوں کے حق میں تو بھائی ہی کی طرح
یق و شفیق۔ ادھر ایک عرصۂ دراز سے صحت بہت خراب ہو گئی تھی (ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر
شار الدم) وغیرہ کے دورے بار بار پڑنے لگے تھے۔ غذا پہلے ہی بہت سادہ تھی اور اب تو
پرہیز کی رعایت سے گویا راہبانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ مطب کا کام کئی مہینے سے چھوٹ گیا
۔ جب تک علاج کرتے رہے ہیں تو ہر طرف سے سلسلۂ نیاز توڑے ہوئے ایک ایسا
من پکڑے ہوئے تھا۔ لکھنؤ میں متعدد ممتاز طبیب ڈاکٹر اور ہومیوپیتھ میرے مخلصوں

میں ہیں۔ بعض تو عزیز قریب ہی ہیں لیکن ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی ضرورت نہ

علاج کے وقت اسمٌ الشافی کے خاص مظہر۔

ایک آدھ دورہ ادھر سخت قسم کا پڑا تھا کہ ۷ مئی (یکشنبہ) کی دوپہر کو چاق بشاش اپنے معالج ڈاکٹر سے ہاتھ ملاتے ملاتے آناً فاناً اپنے مولا کے حضور حاضر ہو گئے۔ میری قسمت میں شاید دوستوں، رفیقوں، مخلصوں کا ماتم ہی کرنا ہے۔ مولانا عبدالرحم ندوی نگرامی کو تو اب خیر اب ایک قرن گزر چکا۔ باقی علامہ سید سلیمان ندوی اور علا مناظر احسن گیلانی دونوں دیکھتے دیکھتے داغ مفارقت دے گئے اور اب تازہ دا ان ڈاکٹر صاحب کا کھانا پڑا ہے ــــــ مرگ مومن کی حقیقت کوئی کیا اد لفظوں میں بیان کرے لیکن بہرحال جذبات و تعلقات کا پاس بھی اس عالم آب و گ میں لازمی ہے۔ ملت کے مشہور خادم و مخدوم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نائب ندوہ انھیں مرحوم کے بھائی ہیں۔ سن میں ان سے بہت چھوٹے اور دوسری والدہ سید احمد شہید رائے بریلوی کے خاندان کے نام لیوا۔ اللہ مغفرت بال بال اور جنت کروٹ کروٹ نصیب فرمائے۔

شفاء الملک

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین لکھنوی

میرا آبائی وطن قصبہ دریاباد شہر لکھنؤ سے کوئی ۴۰ میل جانب مشرق فیض آباد کی طرف واقع ہے
ہم وطن کی حیثیت شہر لکھنؤ کو کم سے کم تین پشتوں سے تو حاصل ہے۔ میرے نانا مولوی حکیم نور کریم
میرے دادا بھی تھے) کی پوری عمر لکھنؤ میں گزری اور ان کا شمار عمائد شہر میں تھا۔ دادا صاحب
مظہر کریم کی بھی تعلیم فرنگی محل میں ہوئی۔ اور والد اور والدہ دونوں کی پیدائش غالباً لکھنؤ
ہوئی۔ شہر میں دو خاندان ایسے تھے جن سے تعلقات دوستانہ سے بڑھ کر عزیزانہ تھے۔ ایک
ان فرنگی محل جس سے یگانگت بالکل عزیزوں کی سی تھی اور دادا صاحب بیعت بھی ہیں
ے۔ اس سے اتر کر خاندان جھوائی ٹولہ کے اطباء کا تھا۔ نانا صاحب کو انھیں لوگوں نے طبیب
بڑھا کر طبیب گر کا لقب دے رکھا تھا۔ ان دو کے بعد ایک تیسرا خاندان اور تھا جس
ابط اتنا قدیم تو نہیں تھا پھر بھی اچھا خاصہ قدیم رہا ہے۔ اس کے رکن اعلیٰ ایک پشت قبل
قطب الدین احمد تھے۔ ان کا کاروبار کتابوں کا تھا اور ان کا پریس نامی بڑے نام نہیں

ت جدید ۱۴ رمئی ۱۹۵۱ء

واقعی اپنے زمانہ میں نامی تھا۔ یہ میرے والد صاحب کے معاصرین میں تھے اور گہرے مذہبی آدمی تھے۔ لکھنؤ کے طبیب گرامی حکیم خواجہ شمس الدین ان ہی کے نامور فرزند تھے۔ اور لکھنؤ میں فنِ طب کی آخری آبرو جمعرات ۲۹ اپریل (۳ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ) کو ۷۵، اور ۸۰ کے درمیان عمر پاکر وفات پائی۔ اور طب یونانی کے قدردانوں کو روتا اور سوگ مناتا چھوڑ گئے۔

میرے ذاتی تعلقات بھی ۴۰۔۴۵ سال سے تھے۔ میرے خالہ زاد بھائی شفاء الملک حکیم عبدالحسیب دریابادی (متوفی ۱۹۵۰ء) لکھنؤ کے ایک نامور طبیب تھے۔ انھیں "محسن الطب" کا لقب ملک سے انھیں حکیم شمس الدین مرحوم نے دلایا تھا۔ ان کے پاس محلہ گھسیاری منڈی میں حکیم صاحب اکثر آمد و رفت رکھتے۔ وہیں ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ مرحوم کے جوہر ایسے کھلے کہ میں ان کے کمالات کا شیفتہ و گرویدہ ہوگیا۔ اور انھوں نے فرط کرم و حسن ظن سے تو میرے لیے ایک بڑا ہی مبالغہ آمیز نام تراش لیا تھا۔

لکھنؤ میں حاذق طبیب اور کامیاب معالج دوسرے دوسرے بھی موجود تھے اور ہیں خصوصاً جھوائی ٹولہ والوں میں۔ لیکن جو مقبولیت خاص عام ہر طبقہ میں ان حکیم صاحب کو غیر معمولی حد تک نصیب ہوئی اس کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ ایوان گورنری سے لے کر رکشا والوں تک جس طبیب کا نام بے تکلف زبانوں پر چڑھا ہوا تھا اور باہر سے لوگ اس کثرت سے جس کے پاس علاج کرانے آتے تھے وہ حکیم شمس الدین ہی تھے۔ حالانکہ مرحوم علاج میں نرم نہ تھے سخت تھے پرہیز بڑا کڑا کراتے تھے اور مریض کے ساتھ مروت کے قائل بالکل نہ تھے۔

حکیم صاحب حافظ قرآن تھے اور قرآن خوب یاد تھا۔ ہر سال محراب پابندی سے سناتے تھے۔ عربی درسیات کی تکمیل مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے کی تھی اور مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے نہ صرف علوم میں شاگردی حاصل کی بلکہ تصوف میں بیعت بھی ان ہی سے قادری سلسلہ میں کی۔ اور اذکار کے شدت سے پابند تھے۔ عمر بھر ذاکر و شاغل رہے۔ اور آخری کئی

سال تو شاہ وصی اللہ خلیفہ حضرت تھانوی کی صحبت و تربیت میں گزارے۔ اس سے وہ ذوق تصوف اور زیادہ نکھر آیا۔

غذا میں سادگی کو مجاہدہ کی حد تک پہنچا دیا تھا بجز دو وقت اور شہد یا چپاتی کے سوا اور کچھ نہ کھاتے۔ لکھنؤ میں رہ کر اور خوش حالی کے باوجود نہ انھیں آم خربوزوں سے کوئی واسطہ نہ شیرمال و تافتان سے نہ حلوے مربے سے دعوت میں جاتے پارٹیوں میں شریک ہوتے پھلوں اور مٹھائیوں سے لدی ہوئی میزیں اور متنجن و مزعفر سے بھرے ہوئے دسترخوان بھی آنکھ سے دیکھ کر چلے آتے۔ انھیں نہ ان سے اور نہ دوسری نعمتوں سے کوئی واسطہ تھا۔ مجھے ان کے اس دائمی پرہیز کو دیکھ کر اردو میں ایک نئے لفظ کا اضافہ کرنا پڑا اور وہ ہے پرہیز کار (گناہ نہیں صرف کھانا) یہ سن کر خوب ہنسے۔

میری تفسیر کے قائل بہت ہی زائد تھے۔ جب بھی ذکر کرتے تو اپنی آنکھیں نیچی ہو جاتی تھیں اور ایک آدھ بار تو اتنا آگے بڑھ گئے کہ مجھے ذرا صفائی سے بالکل روک دینا پڑا۔

——— دوسرے شفاء الملک حکیم عبداللطیف مرحوم بھی کچھ ایسا ہی حسن ظن اپنے کرم و التفات کے ساتھ رکھتے لیکن وہ بہرحال حدود کے اندر رہتے یہ حکیم شمس الدین صاحب ان سے بالکل الگ مرفوع القلم کے درجہ میں پہونچ جاتے تھے۔

غذا کی سادگی کی طرح پیدل چلنے (مشی) کے بھی بڑے پابند تھے۔ جوانی بھر تو میلوں چلتے رہے اور خوب تیز۔ ایک دفعہ علی گڑھ کے سفر میں کسی چھوٹے اسٹیشن پر کسی ضرورت سے اترے اتنے میں گاڑی چل دی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ حکیم صاحب بے اختیار دوڑے اور بالآخر گاڑی پکڑ لی ——— اب نہ اتنی مسافت روزانہ طے کرتے تھے اور نہ اتنا تیز چلتے تھے پھر بھی چلنے کی عادت جاری رہی۔ اور برسوں موٹر رکھا جب بھی یہ عادت نہ چھوڑی۔

لباس بڑا سادہ پہنتے اور خاص لکھنؤ کی وضع کا گریبانوں میں انگرکھا دو پلی ٹوپی پہن کر نکلنے والے اب کتنے کم رہ گئے ہیں۔ ان ہی چند میں ایک حکیم صاحب بھی تھے۔ بات چیت

نشست و برخاست، چال ڈھال سب سے مشرقیت لکھنؤیت نمایاں، مستعدی اور کارکردگی تو جیسے ان کی ذات پر ختم تھی۔ تڑ بڑا بھی یہ کام کیا ابھی وہ۔ ابھی یہاں تھے ابھی دم بھر میں وہاں پہونچ گئے۔ ظریف الملک شوکت تھانوی کہا کرتے تھے کہ اللہ میاں نے سب کو مٹی سے پیدا کیا مگر حکیم صاحب کی تخلیق میں ایک عنصر بجلی کا بھی ملا دیا۔

بولنے والے بھی اچھے تھے ایک رسالہ بھی فن خطابت پر لکھ دیا تھا۔ عربی زبان پر عبور تھا۔ اردو شعر و ادب کا بھی بڑا ذوق رکھتے تھے۔ متعدد سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں کے بھی ممبر رہے۔ مثلاً یوپی انڈین میڈیسن بورڈ، ریلوے کی مشورتی کمیٹی بعض ملی کمیٹیاں اور مجلسیں اس کے علاوہ مثلاً ندوہ کی انتظامی کمیٹی۔ انجمن اصلاح المسلمین وغیرہ سالہا سال لکھنؤ میونسپل کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔ ایک بار کیا ہوا کہ حکیم صاحب جب میونسپل ممبری کے لئے کھڑے ہوئے تو لکھنؤ کے دل لگی بازوں نے حکیم صاحب سے چشمک کی بنا پر چوک کی ایک بالانشین کو بھی مقابلہ پر مجبور کر دیا۔ مسماۃ کا نام دلربا تھا حکیم صاحب بھلا ہارنے والے تھے، عین الکشن کے دن ایک بند تصنیف کر کے لڑکوں کو یاد کرا دیا ٹیپ کا مصرعہ تھا ؎ دیجئے دل دلربا کو ووٹ شمس الدین کو

اور لڑکوں نے مصرعہ ثانی کے آخری ٹکڑے کو ایسا چیخ چیخ کر گایا کہ ساری فضا ووٹ شمس الدین کو، ووٹ شمس الدین کو، سے گونج گئی۔ حکیم صاحب کا نسخہ تیر بہدف نکلا۔ اور انھیں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور مسماۃ اپنی ناکامی کے بعد حکیم صاحب کو مبارک باد دینے آئیں اور چلتے چلتے چوٹ بھی حکیم صاحب پر لکھنؤ کے لطیف و بلیغ انداز میں کر گئیں۔ "لونڈی کو بھلا مقابلہ کی کیا مجال تھی اچھا ہوا، جو ہوا، یہی ہونا تھا لیکن باہر کی دنیا کیا کہے گی۔ یہی کہے گی کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں، مریض زیادہ۔"

بے طمعی، وضعداری، اخلاص خاص جوہر تھے۔ کثرت سے مریضوں کو دوا اس تک مفت دے دیتے تھے ایک جواہر مہرہ خاص محنت و ترکیب کے ساتھ تیار کیا تھا۔ بڑا مجرب اور

موثر۔ اس کی شیشیوں پر شیشیاں دوست احباب کے لیے بلا قیمت وقف تھیں۔ طب کے جزِ عملی میں جو شہرت تھی ویسی ہی دست گاہ جزِ علمی میں بھی تھی۔ پڑھاتے تو خوب تھے اور فنونِ بلاغت کے تو گویا ماہر تھے، بقراط کے فقرے زبانی یاد تھے اور اس فن کے بعد پھر ذوق شعر و ادب سے تھا۔ عربی و فارسی اور ان دونوں سے بڑھ کر اردو شعر و ادب کا۔ لکھنؤ کا ایک خصوصی فن ضلع جگت ہے۔ اس میں بھی یہ اسلامیت، مشرقیت و لکھنویت کا پیکر بند نہ تھا۔

بیمار ہوئے اور بد قسمتی سے بیماری کی ہر صورت جھیلی۔ علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رہا۔ کینسر کے شبہ میں تشخیص کرانے حکیم صاحب بمبئی گئے اور جانچ ہی کے طریقوں کی کثرت نے عاجز کر دیا۔ پھر بہترین علاج لکھنؤ میں بھی ہوتا رہا۔ آخر میں نطق بالکل جاتا رہا۔ لکھنے پڑھنے سے معذور تو مدتوں قبل ہو گئے تھے۔ اب بات چیت کے لیے محض اشاروں کا سہارا تھا۔ منظر کس درجہ عبرت کا تھا۔ وقت کا حاذق ترین طبیب کرب سے تڑپ رہا ہے۔ فن نہ اپنا کام دے رہا ہے نہ اپنے کسی نامور ہم فن کا۔ خود جو ایک بہترین خطیب و ادیب تھا وہ منھ سے دو ایک مفرد کلمہ نکالنے کے بجائے بے کسی کی تصویر بنا ہوا دوسروں کا منہ تکتا تھا۔ کیا شان بے نیازی ہے اور عبدیت کے مرحلے کس کس طرح طے ہوتے ہیں۔ ایک اسی شہر کے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف مرحوم تھے جو ابھی چند مہینے قبل ایسی بجلی کی تیزی سے رخصت ہوئے کہ ساعت موعود کا اندازہ ایک منٹ قبل بھی خود نہ کر سکے۔ نہ پاس بیٹھے ہوئے شاگرد اور معالج ڈاکٹر۔ اور اب دوسرے شفاء الملک یہ تھے کہ بالکل اس کے مقابل خوب ہی کرب کے ایک ایک جزیہ کا ادراک کرایا جاتا رہا۔ ——— اور دنیا نے جسے شفاء الملک کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اپنے نفسِ نفیس کی شفا پر بھی قادر نہ ہو سکا۔ اور ہزاروں کو اپنا سوگوار چھوڑ کر جنت کی بے شمار نعمتوں اور بے حساب لذتوں کے شوق میں اس دنیائے دنی و فانی سے رخصت ہو گیا۔ اللہ اس کی گود کو اپنی رحمتوں سے مالا مال کر دے۔

دیگر حضرات

شیخ خبدار

نام فرضی نہیں اصلی ہے۔ ابھی گزرے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے، مئی سنہ ۴۱ء ہی کی بات ہے
اسی لکھنؤ میں رہتے تھے، دفتر صدق کے پچھواڑے اور صدق نویس کے لکھنؤی مکان کے مقابل۔ عالم
نہ فاضل، واعظ نہ خطیب، شاعر نہ ادیب، لکڑی کے ایک معمولی دوکاندار، کم سواد، کم استعداد۔
ڈیل ڈول کے اچھے، جسم کے ہٹے کٹے۔ معمر ہو کر وفات پائی مشہور گورستان عیش باغ (نام بھی کتنا
بلیغ ہے) میں جگہ پائی۔ دن گزرے، مہینے گزرے، کچی قبر کی ابھی کیا، پھر زوروں کی برسات پانی
بکار یا لحد کے اوپر ہوا اور لحد کے اندر ہوا قبر بیٹھ گئی۔ جون، جولائی، اگست، ستمبر پوری برسات
کھا لینے کے بعد کہیں نومبر دسمبر میں وارثوں کو قبر کی مرمت کا خیال آیا کوئی سات مہینے ہو چکے تھے مولا
نے کہا کہ قبر کو نیچے سے ٹھیک کرنا ہوگا، مٹی کا ڈھیر کھودا گیا اور کھولا گیا، تختوں کے نیچے سے نمودار
سوکھی ہوئی ہڈیاں یا ان کا ایسا ہوا چونا نہیں بلکہ اصل لاش جوں کی توں! ــــ ایک پیر سے
کفن ذرا سرکا ہوا تھا، انگوٹھے پر کے بال، تلوے کی جھریاں، پشت پا کے گٹے تک کا ایک ایک خط و
خال بدستور! اللہ اکبر!

سات مہینے کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے! اور وہ بھی پوری برسات گزارے ہوئے! ــــ
جسم کو سڑانے اور گلانے کیلئے تو چند دن کا وقفہ بھی بہت ہے ــــ اس پر بھی نعش نہ سڑتی
ہے نہ گلتی ہے، کفن تک اسی حال پر قائم ہے، عطر کے دھبے اسی طرح پڑے ہوئے ہیں فرق
صرف اتنا ہے کہ پانی کے اثر سے پھیل زیادہ گئے ہیں، خوشبو کا فقدان اور عطر کی اس وقت تک

(صدق ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء)

قائم، قبر کھولتے وقت نہ سڑاہند محسوس ہوئی اور نہ بھبک آئی ناک میں وہی خوشبو عطر کافور کی
ئی گویا تازہ میت کی تازہ خوشبو ہیں۔ تختے دو ایک ٹوٹ کر قبر کے اندر گر چکے تھے، چاہئے یہ
تھا کہ میت کو گزند پہنچتا اور پانی کے اثر سے نعش اور زیادہ اندر کو دھنس جاتی ہوا اس کے برعکس
نعش ہر طرح کے گزند سے محفوظ ہی نہیں رہی پانی کے اثر سے نیچے کی مٹی اوپر کو سرک آئی اور نعش بلند تر
ہو کر سطح زمین کے قریب آگئی! ـــــ قیاس اور اندازے سارے کے سارے غلط نکلے اور جو گھلنے
مٹنے اور فنا ہونے کیلئے ہی تھا، اس میں آثار اور جلوے فانی کے نہیں باقی کے پیدا ہو گئے۔

میت عالم فاضل کی نہ تھی، واعظ و مدرس کی نہ تھی۔ مسجد کے موذن کی تھی، نماز کیلئے
بلانے والے کی تھی، موذنی تنخواہ کے معاوضہ میں نہیں اجر کی طمع میں، جنت کی حرص میں رات
ہے سے اٹھتے، تہجد فرض نماز کی پابندی کی طرح اہتمام سے ادا کرتے پھر مسجد کیلئے نکل کھڑے
ہوتے اور جاڑے ہوتے تو نمازیوں کیلئے پانی گرم کرتے اذان اس جوش اور کڑک کے ساتھ
دیتے کہ دور دور تک سونے والے بیدار ہو جاتے اور پھر محلہ میں گشت کر کر کے نمازیوں کو مسجد کی
طرف لاتے۔ نماز رات کی ہو یا کسی وقت کی، بس یہی معمول ہو گیا تھا، سنا ہے کہ جان بھی اسی حالت
میں دی کہ بیٹھے بیٹھے نماز تہجد کے لئے نیت کرنے کے بعد ہاتھ باندھ چکے تھے، عمر بھر کی کمائی کہیں
بیکار جا سکتی تھی؟ اللہ کے نام کی پکار ضائع ہو سکتی تھی؟ اللہ کے نام کو روز فضائے ہوائی میں بلند
[illegible] ونشر کرنے والا کہیں لطف و التفات سے محروم رہ سکتا ہے؟ غیب میں جو کچھ بھی
ہوا تھی شہادت تو ہم ناسوتیوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں! وہی ناسوتی حس کے کان ابھی کل اللہ اکبر
کی صداؤں سے گونج رہے تھے، پانی اور مٹی کے طبعی اثرات بالکل بے کار کر دیئے گئے کہ ایمان والے
کی نعش کے احترام کا قانون بلند ہوا اور روشن ہوا اسی بیسویں صدی کی مادی دنیا میں! ۔

ایک قدیم ترین مخلص کی وفات[۱]

وہ صدق کے خریدار ہی نہیں قدردان اور گہرے قدردان اس وقت سے تھے جب وہ سچ کے نام سے اوّل اوّل ۱۹۲۵ء میں نکلا تھا اور مرحوم غالباً ۲۶ء ہی سے اس کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور اس کے شذروں اور مضمونوں کا ترجمہ اپنی مادری زبان گجراتی میں کرکے مسلم گجرات (یا کسی اور نام کے ہفتہ وار) میں شائع کرانے لگے تھے۔

گجرات کی میمن برادری کے تھے نام احمد تھا۔ اور قلمی نام غریب۔ گجراتی پریس میں اسی نام سے لکھتے تھے اور اپنی زبان کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے ۱۵؍ جولائی کا بمبئی سے لکھا ہوا خط ۱۸؍ کی شام کو موصول ہوا کہ یوم جمعہ کو شب میں دفعۃً انتقال کیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

بمبئی میں اور بھائیوں کی شرکت میں کٹلری (چھری کانٹے چمچے) کا کاروبار اچھے پیمانہ پر کرتے تھے تجارتی کاروبار کے ساتھ بڑے دیندار تھے اور ان کی دینداری لازمی نہیں متعدی تھی ہر دینی و ملی کام میں پیش پیش رہتے حج خدا معلوم کتنے کئے اور دوسروں کو کرائے۔ انجمن خدام النبی کے خاص کارکن تھے اور حاجیوں کی خدمت گویا اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے۔ ماہنامہ البلاغ گویا انھیں کا تھا۔ حاجیوں کے لئے کتابچہ اور مقالے بھی لکھ لکھ کر چھپواتے رہتے۔

---

[۱] منقول از صدق جدید ۲۸ جولائی ۶۷ء جلد نمبر ۱۷ نمبر ۳۵

تین بھائی اور تھے ماشاءاللہ سب دیندار شب زندہ دار اور عبادت اور دینداری میں وہی شاید سب کے پیشوا و بھائیوں اور والدہ کی وفات پر صدق میں نوٹ نکل چکے ہیں اب ایک بھائی رہ گئے ہیں حافظ محمد صدیق سلمہ اللہ انھیں مدتوں زندہ و سلامت رکھے مرحوم نے خود بھی کاروبار مکہ و جدہ میں کھول رکھے تھے اور سال کا بڑا حصہ وہیں گزارنے لگے تھے ہندوستان اور مہاراشٹر کے حالات سے مایوس ہو کر ابھی چند مہینے ہوئے کراچی ہجرت کر گئے تھے۔ موت اسی سرزمین پر آئی۔

اللہ نے مجھے مخلصوں کی ایک بڑی تعداد عطا کر رکھی ہے یہ ان مخلصوں اور محسنوں میں سے ممتاز مرتبہ رکھتے تھے ان کے حسن سلوک اور خدمات کی تفصیل اب اخبار کے صفحات پر کیا بیان کی جائے۔ بمدت دراز ہوئے ایک بار پورے تین ہزار کی رقم میرے حوالہ کردی کہ میں اس کو خیرات و صدقات کی مد میں جس طرح چاہوں صرف کر دوں اس وقت کے تین ہزار آج کے ۱۴، ۱۵ ہزار کے برابر ہوئے، صدق کی امداد کتنے موقعوں پر اور کن کن طریقوں سے، اس کی تفصیل اب ذہن میں نہیں، مناجات مقبول کا بھی ایک ایڈیشن انھیں نے اپنے کسی عزیز یا عزیزہ کے ایصال ثواب کے لئے چھپوایا تھا۔

⁂ ~~~~~~ ⁂ ~~~~~~ ⁂

مارچ ۲۹ء میں جب حج کو گیا ہوں اس وقت نوجوان تھے اب ظاہر ہے کہ پوتے نواسے والے ہو چکے ہوں گے ایسے خوش فہم مخلص کم ہی کسی کو نصیب ہوتے ہیں اور جس کسی کو مل جائیں اسے بھی بڑی نعمت اس کو حاصل ہو گئی اس زمانہ کا رہے ان کا تعلق دوستانہ نہیں عزیزانہ بلکہ والہانہ قائم ہو گیا تھا اور آج جو عزیزی حافظ صدیق کو تعزیت نامہ میں نے لکھا اس میں لکھ دیا تعزیت آپ کے بھائیوں کی نہیں بلکہ اپنے بھائی ہی کی ہے فی الواقع یہ محسوس کر رہا ہوں کہ بازو ٹوٹ گیا قوت بازو اٹھ گیا۔

ربِ کریم دل سے دعا جسم کے رونئیں رونئیں سے نکل رہی ہے کہ دین ملت کے اس مخلص

دمِ گرم خادم کو اپنے لطفِ بے غایت اور کرمِ بے نہایت کے سایہ میں جگہ دے اور جنت الفردوس کو اس کا دائمی مسکن بنا دے۔

سیّد صدّیق حسن مرحوم

۱۹۰۴ء تا ۱۹۶۳ء

●

جمعہ کا دن ہے ۔ ۱۰ بجے کا وقت اور تاریخ ستمبر کی چھٹی اور ربیع الثانی کی سترھویں کہ ایک ہندوستانی مسافر عازمِ پاکستان بظاہر تندرست و توانا، امرتسر پلیٹ فارم پر اپنا پاسپورٹ افسرانِ متعلقہ کے سامنے پیش کرتا ہے اور ابھی پہلا فقرہ بھی اس کے منھ سے نہیں تمام ہونے پایا تھا کہ پیمانۂ حیات تمام ہو جاتا ہے۔ حکمِ قضا بجلی کی سرعت سے پہونچتا ہے۔ اور وہ غریب الدیار اُسی لمحہ اور اُسی آن دعوتِ اجل کو لبیک کہتا بجائے سفرِ پاکستان کے سفرِ آخرت پر روانہ ہو جاتا ہے ——— حرمِ محترم ساتھ میں ہیں، بہنوئی کی وفاتِ ناگہانی کا تار پاکر اپنے شوہر کو ساتھ لئے حقیقی بہن کے پاس تعزیت میں مُلتان جا رہی تھیں۔ آگے بڑھنے سے قبل ذرا ایک منٹ کے لئے اُس کی بیکسی اور بیچارگی کا تصور دل میں لے آئیے جس نے چشم زدن میں اپنے سُہاگ کو اجڑتے اپنی بادشاہت کو لٹتے دیکھ لیا! اور وہ بھی کہاں، وطن میں اور اپنوں کے درمیان نہیں وطنِ پیدائش (الہ آباد) اور وطنِ اقامت لکھنؤ سے سیکڑوں میل دور تمام تر اجنبیوں کے درمیان! بیوہ ہوں گی نہ بہ پردہ۔ لکھنؤ کے لئے جانے والی سُہاگن دم کے دم میں بے خان و مان خود ہی بیوہ ہو ——— آگے بڑھنے کا راستہ بند! لکھنؤ واپس آئے تو جنازہ اوڑھے ہوئے قافلے کو ساتھ لئے ہوئے۔ تو کیونکر اور کس طریقہ پر تیز رفتار لاری کا انتظام!

صدقِ جدید ۲۰ر ستمبر ۱۹۶۳ء

سیکڑوں سے اوپر خرچ کے بعد بھی کون کر دے؟ کسی پردہ نشین خاتون پر یہ وقت کبھی کبھوں پڑا ہوگا؟ غضب کا المیہ شعر و افسانہ کے خواب میں نہیں واقعات کی جیتی جاگتی دنیا میں!

یہ غربت و مسافرت میں یوں بالکل اچانک جان دے کر اور جمعہ کا مبارک دن پاکر کسی درجہ میں شہادت کا مرتبہ حاصل کر لینے والا مسافر آخر تھا کون؟

کوئی ایرے غیرے نہیں یو۔پی کا سب سے سینئر سولین، گورنر کے بعد ریاست کا سب سے اعلا انتظامی عہدیدار بورڈ آف ریونیو کا سینئر ممبر! ــــ نام سید صدیق حسن مولد ضلع الہ آباد کا مشہور قصبہ کڑا۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ، پٹنہ وغیرہ میں پاکر تکمیل آکسفورڈ یونی ورسٹی میں کی، ریاضیات اور عربی زبان دونوں کے خصوصی طالب علم رہے، پھر آئی۔سی۔ایس میں بیٹھے اور امتیاز کے ساتھ اس میں کامیابی حاصل کی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان پلٹے تو عہدے پر عہدے جلد جلد حاصل کرنے شروع کئے ابھی جائنٹ مجسٹریٹ ابھی کلکٹر ابھی فلاں صیغہ کے سکریٹری ابھی فلاں محکمہ کے ڈائرکٹر لکھنؤ اور فیض آباد کے کمشنر ہوئے اور اب پنشن کے قریب اس اعلا عہدے پر فائز تھے۔ کون جان سکتا تھا کہ موت دنیوی معیار سے اس حیرتناک اور حسرت ناک طریقہ پر استقبال کرے گی اور جنازہ ہزار بارہ سو کے خرچ کے بعد بھاگم بھاگ ۲۰۔۲۱ گھنٹے کے اندر لکھنؤ پہونچایا جائے گا۔ موت یہ اسباب ظاہر ایک دماغی شریان کے پھٹ جانے سے واقع ہوئی تھی، ناک سے خون جاری تھا۔ اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ میت جلد سے جلد اپنے آرامگاہ خاکی تک پہنچا دی جائے ــــ ڈھائی گھنٹے کا وقت تو حکام کی سرد مہری اور ضابطہ پرستی کی نذر ہو گیا تھا اور اسٹیشن کے قلیوں بیچاروں نے اگر پوری مستعدی سے کام نہ لیا ہوتا تو خدا جانے کتنی اور تاخیر واقع ہوتی۔

اس ظرف و شرافت کے انسان اور اس دل و دماغ کے مسلمان کم تر ہی دیکھنے میں آتے ہیں وضع ظاہری کی سادگی دیکھئے تو اس مرتبہ کو کیا اس سے کہیں کم درجہ کے بھی افسر نظر نہ آتے۔ گھر ہی پر نہیں اکثر تقریبات میں دیکھئے تو بغیر شیروانی کے محض کرتہ پائجامہ پہنے نظر

آتے ہی جگہ جہاں مل گئی بس وہیں بیٹھ گئے تواضع کا یہ عالم کہ بڑھنا اور آگے چلنا تو جانتے ہی نہ تھے بس دوسروں کو ہی آگے بڑھاتے اور خود لطف پیچھے چلنے میں محسوس کرتے۔ غذا بھی ایسی ہی سادہ بلکہ پرہیزی، موٹر دوسروں کی سواری کے لئے وقف، تنخواہ کا بڑا معقول حصہ عزیزوں بلکہ بیگانوں کی امداد کی نذر، عقائد میں بڑے پختہ، نماز روزے کے پورے پابند عجب نہیں کہ تہجد گزار بھی ہوں حج سے بھی فراغت کئے ہوئے داد و دہش اور لوگوں کو خفیہ و علانیہ امداد کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں، عزیزوں اور اپنوں سے لے کر غریبوں بیگانوں تک کسی پر فیض کا دروازہ جیسے بند ہی نہیں، مسلمانوں کے ہر کام میں پیش پیش، ہر ادارہ کی خدمت جیب سے بھی اور زبان و قلم سے بھی سرگرم عمل لکھنؤ کے چھوٹے بڑے ہر ادارہ کرامت حسین گرلز کالج، اصلاح المسلمین، ایک آنہ فنڈ وغیرہ کی سرپرستی شغل زندگی، علی گڑھ اور ندوہ دونوں سے خصوصی تعلق بلکہ اخلاص اور ندوہ سے تو کہنا چاہئے کہ اخص۔ جہاں کہیں بھی رہتے سرکاری حلقوں کے لئے بھی ایک علمی اسلامی ماحول پیدا کر دیتے۔

اسلامیات کا مطالعہ انگریزی و اردو دونوں میں بڑا وسیع، عربی کے بھی قدیم و جدید ذخیرہ دینیات پر نظر، علم کی تشنگی اس پر بھی نہ بجھتی اور علم دین کی طلب برابر جاری رہتی لکھنؤ میں ندوہ کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کو گویا باقاعدہ اپنا استاد مقرر کر لیا تھا ہر ہفتہ اپنی کوٹھی پر حلقہ درس منعقد کرتے، مولانا کو اپنی سواری بھیج کر بلاتے اور حلقہ درس میں دوسرے مسلمان عہدیداروں کو بھی شریک کرتے کسر نفسی کا یہ عالم کہ باوجود اچھے خاصے عربی داں ہونے کے اپنے کو ظاہر یوں کرتے کہ جیسے مبتدی بھی نہیں۔!

اسلامیت خاموش مطالعہ تک محدود نہ تھی موقع پاتے تو قلمی جہاد میں بھی بند نہ تھے انگریزی تحریر پر اردو ہی کی طرح قادر تھے۔ ڈیڑھ سال ادھر کی بات ہے کہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس دھون نے اپنی تقریر میں خواہ مخواہ قانون اسلام پر

پر نکتہ چینی کر دی۔ مثلاً سود کی حرمت نے مسلمانوں میں تجارتی ترقی اور حوصلہ مندی روک دی تقسیم وراثت نے مسلمانوں کی مالی حالت سقیم کر دی وغیرہ۔ مرحوم سے اس کی برداشت نہ ہو سکی ایک مفصل و مدلل مضمون بڑے شائستہ و متین انداز میں لکھنؤ کے روزنامہ نیشنل ہیرالڈ میں شائع کرا دیا۔ اور اس سے حریدۂ اسلام (کراچی) نے بھی نقل کیا صدق ۱۲ اپریل ۱۹۶۱ء میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اردو میں بھی برابر کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے صدق ہی میں اُن کے قلم سے نکلے ہوئے متعدد مراسلے نکل چکے ہیں نام کا اظہار ان کے سرکاری مرتبہ و منصب کے لحاظ سے مناسب نہ تھا اس وقت بھی تدوین قرآن پر ایک پوری کتاب تحقیق سے لکھ رہے تھے وفات سے دو ہی تین ہفتہ قبل اس کا مسودہ دیکھنے کو عنایت کیا تھا۔ عملی زندگی پوری اقبال کے اس شعر کی تفسیر و تصویر ہے

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اچھے اور پختہ کار مومن یعنی متعصب مسلمان کے نہیں اور اسلام ہرگز حقوق وطن و ہمسایگی کی ادائی میں حائل نہیں ہوتا مرحوم ایک زندہ پیکر اس توازن اور جامعیت کا ہوتے تھے۔ بالادست ہندو افسر ان کے کام سے انتظام سے مزاج سے خوش اور برابر کے ہندو عہدہ دار ان کی محبت کا کلمہ پڑھتے رہے۔ سول سروس کے ایک ساتھی اے۔ بی سنگھ تھے ان پر غلط یا صحیح ایک مقدمہ قتل عمد کا چل گیا اچھے اچھے ساتھی ان کے سایہ سے بھی بھاگنے لگے اس وقت جس نے پورا حق رفاقت دوستی ادا کر کے دکھایا وہ ان ہی کا یہی مسلمان رفیق تھا ـــــ انھوں نے یہی نہیں کہ دس ہزار کی گرانقدر ضمانت پیش کر دی بلکہ کچھ ہی دن کے بعد جب وہ قید ہستی سے رہائی پا گئے تو ان کے دونوں یتیم لڑکوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ ولایت بھیج کر انھیں تعلیم دلائی اور ان کی شادیوں کے مصارف بھی اپنے سر لے لئے اس ظرف کی مثالیں اس زمانہ میں تو عنقا

کے حکم میں ہیں۔

یوپی میں بھودان تحریک والے آچاریہ ونوبا کو جب ۶ لاکھ ایکڑ زمین مل گئی تو اہم اور پیچیدہ سوال اس زمین کی تقسیم و انتظام کا پیش آیا۔ اس وقت کے وزیر اعلا (کسی اور نے نہیں)، ڈاکٹر سمپورنانند نے بلا توقف کہا کہ اس بڑے کام کے لئے اس کمیٹی کی چیرمینی کے لئے ہمارے یہاں صدیق حسن سے بہتر کوئی افسر نہیں مل سکتا۔ مسلمان قوم کو دنیا میں سربلند کرنے والی ہستیاں بس ایسی ہی ہو سکتی ہیں۔

شعر و ادب کے بھی ماہر اس درجہ تھے کہ جتنے کسی اور چیز کے۔ مدتوں میں بدگمان رہا کہ اپنی سرکاری منصبی مصروفیتوں کے ساتھ یہ اچھے شاعر بھلا کیسے ہو سکتے ہیں، ادبی ذہین ہیں بس کبھی کبھی شوقیہ اور بہ طور تفریح ایک آدھ ہلکی پھلکی غزل کہہ لیتے ہوں گے۔ اور اس بدگمانی نے عرصہ تک ان کی نظمیں توجہ کے ساتھ پڑھنے ہی نہ دیں لیکن بالآخر جب ایک بار ان کی نظم خیال کر کے پڑھی تو آنکھیں کھل گئیں۔ شاعرانہ خوبیاں اور لطافتیں ساری کی ساری موجود۔ اپنی خفت مٹانے کو انھیں خط لکھا کہ آپ تو چھپے رستم نکلے، میں سمجھتا تھا کہ طبع موزوں رکھتے ہیں کبھی کبھی شوقیہ کچھ کہہ لیتے ہوں گے اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ آپ پورے شاعر ہونا کیا معنی کچھ استادانہ سا درجہ حاصل کئے ہوئے ہیں اور یہ تاثر بعد کو ان کی ہر نظم سے متعلق قائم رہا۔ میرے ساتھ اردو کتابوں کی سرکاری انعامی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس میں بھی ان کی سخن فہمی جوہر شناسی صحیح نقطہ نظر کے نمونے بار بار دیکھنے میں آتے رہے۔

ازراہ ذاتی تعلقات کو گیا کہوں صدیق کے خصوصی قدر دانوں میں سے تھے اور میری ہر کتاب کی حوصلہ افزائی ہی کرتے رہتے۔ انگریزی کتابوں کی جواب گرانی ہے ظاہر ہی ہے

کرتے کہ اسلامیات سے متعلق انگریزی کی جو نئی کتاب خریدتے پہلے میرے ہی پاس بھیجدیتے اور جب میں اُسے واپس کرتا تب اُسے پڑھنا شروع کرتے۔ عام برتاؤ عزیز کا سا کیا، بزرگ، قریب کا سا تھا۔ آخری ملاقات وفات سے کُل پانچ دن قبل پہلی ستمبر کی شام تک رہی تھی۔ ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں شرکت کے بعد حسب معمول اپنی سواری پر پہنچانے میری قیام گاہ تک آئے۔

عزیز دوست، اور پیارے مخلص، رخصتی سلام قبول ہو تمہارے حسن انجام کی شہادت دینے کو جمعہ کے دن اور عالم مسافرت کی موت ہی کافی نہیں بلکہ تمہارے سوگواران کا، ہجوم عظیم اور خدا جانے کتنی بیواؤں کی آہیں یتیموں کے آنسو اور ناداروں کا نالۂ فریاد مبارک ہو تم کو کہ تمہیں غسل میت ندوہ کے شیخ التفسیر نے اپنے ہاتھوں سے دیا، ندوہ کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی نے نماز پڑھائی اور جنازہ برداروں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور کتنے ہی نامی مشائخ اور صالحین شامل رہے، نیکی و شرافت کے تم ریکارڈ قائم کر گئے۔ اور دنیا کو صدیقیت کا ایک عملی درس دے گئے!

بارگاہِ بے نیاز، و غنی عن العالمین میں کسی کو دم مارنے کی مجال ورنہ جی تو بے اختیار چیخیں مارتے ہوئے یہی عرض کرنے کو تھا کہ اپنی عزت و اجلال کے صدقے ہم بے بصروں کی آزمائش اتنی سخت نہ فرما کہ ہمارا ظرف تحمل جواب دے اٹھے، لیکن نہیں تیری آزمائشیں تو سدا ایسی ہی ساری ہیں۔ نادان بندوں کی مصلحت بینیوں سے کہیں بالاتر، مرسلین مقبولین تک جھٹکے کھاتے کھاتے پکار اٹھے متیٰ نصر اللہ اور موسیٰ کلیم نبی اولو العزم تک کی زبان سے نکل گیا ان ہی الا فتنتک اور رمز شناس عارفوں نے آخر کچھ سمجھ کر ہی تو تیری زبان سے ادا کیا ہے ؎

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

مولوی مسعود علی ندوی مرحوم

ایک بہت ہی محدود حلقہ کو چھوڑ کر اب اس نام ہی سے کون واقف رہ گیا ہے تحریک خلافت کے دورِ شباب سنہ ۲۱-۱۹۲۲ء میں یہ گمنامی اور بے نشانی نہ تھی۔ ترک موالات کی ایک دنیا مولانا شوکت علی کے اس خلیفہ یا لفٹننٹ کے نام اور کام سے گونج رہی تھی اور پنڈت موتی لال نہرو، جواہر لال کا گھر آنند بھون بھی ان کے قدوم میمنت لزوم سے

بے نا آشنا نہ تھا۔ عمر کی آخری سانس ۱۲ اگست ۱۹۶۱ء کو لی۔ شہرت عمر کی بے وفا زندگی سالہا سال پہلے ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

بارہ بنکی ضلع میں مسولی اور بانسہ سے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ بھیارہ ہے، وہیں خاندان قدوائی کی ایک شاخ میں اور ایک زمیندار کے گھر میں آنکھ کھولی وجیہہ و شکیل شروع سے تھے اور ہر عملی انتظامی کام میں پیش پیش ۱۹۰۸ء میں مجھ سے ملاقات ہوئی سن میں وہ مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑے ہوں گے میں اسکول کے نویں دسویں درجہ میں تھا۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی بڑھی، رسم اخلاص سالہا سال قائم رہی رفاقت و شناسائی بالآخر ۶۰ سال کے بعد تمام ہوئی

اتنی مدت میں خدا معلوم کتنے انقلابات ہوئے کتنے اتار چڑھاؤ پیش آئے۔ کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے جیسے کہ انسانی تعلقات میں پیش آتے ہی رہتے ہیں مدت تعلق کی یہ درازی خود ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے

شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کر دیئے تھے۔ آج طلبہ کی اس ٹولی کے سردار کل اسٹرائیک کے علمبردار مولانا شبلی پر اپنے حسن خدمات سے سکہ بٹھا دیا تھا

منقول از صدق جدید، ۱۰ ستمبر ۱۹۶۱ء جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۴۱

استاد کی وفات کے وقت جب علمی جانشینی کی دستارِ فضیلت سید سلیمان کے سر بندھی تو دار المصنفین کے پریس اور سارے کاروبار کی منیجری کا خلعت انھیں کے جسم پر راس آیا اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نباہا۔

ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے شکار کے شوقین اور دوڑ دھوپ کے ہر کام میں منجھے ہوئے تھے سانپ کو دوڑ کر مارتے تھے۔ خوش انتظامی خوش دماغی اور جفاکشی کے پتلے تھے اور زندہ دلی شگفتہ مزاجی کے بادشاہ روتوں کو جب چاہا ہنسا دیا روٹھوں کو جب چاہا منالیا اسم مسعود کی نسبت سے پورا نام 'سالار مسعود غازی' ہم نیاز مندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ جزاحاً مجھے 'میاں' کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور میں بھی جواب میں انھیں 'استاد' کہنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت تھانویؒ سے مدتوں باغی رہے پھر زمانے نے جھکایا تو ایسا کہ ان کے قدموں ہی سے لگ گئے۔ تھانہ بھون جا کر لمبی حاضری دی اور بالآخر چھوٹی خلافت (مجاز صحبت) کی سند پائی اوراد و نوافل وغیرہ کے اس وقت سے شدید پابند ہو گئے تھے۔

برسوں قبل بیمار ہوئے اور پھر ایسا گرے کہ ہر ممکن علاج و تدبیر کے باوجود ہر روز اور زیادہ ہی گرتے چلے گئے پہلے پیروں نے جواب دیا ادھر بصارت نے آنکھیں چرانا شروع کیں اور ادھر سماعت سے بے بہرہ ہو گئے، گھس کر بھی چلنے کی سکت نہ رہی اور ٹینس کے کھلاڑی اور شکار کا میدان مارنے والے کے لیے یہ دن بھی آگیا کہ وہ دو مضبوط و توانا آدمی ادھر ادھر بغل میں ہاتھ دیتے کہ ہاتھوں میں ٹانگ لیتے اور سامان کی گٹھری کی طرح اٹھاتے اور یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتے۔ اللھم احفظنا۔ یہ دردناک اور عبرت انگیز نظارہ ہفتوں نہیں مہینوں بلکہ برسوں دیکھنے میں آتا رہا۔

مرحوم و مغفور کی اہم ترین یادگار دو مسجدیں ہیں ایک احاطہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں اور دوسری احاطہ دار العلوم ندوہ میں خوش سلیقگی، نفاست اور سامان راحت کی

جامعیت میں اپنی نظیر آپ۔ جب تک ان مسجدوں میں ایک نمازی بھی باقی رہے گا، اجرِ بے حساب و غیر منقطع اس بانیِ تعمیر کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہے گا۔

~~~~~~

○

"جشنِ نوشابہ"

لکھنؤ ۲۹ مارچ جمعہ، ۷ بجے صبح، مرشد آباد منزل (دفتر حق و صدق) کی بارہ دری میں اس وقت یہ چہل پہل کیسی ہے؟ چہل پہل ماتمی رنگ کی۔ جسے دیکھئے روئے دیتا ہے، رو ہی رہا ہے، ہنسنا مسکرانا جیسے سب بھول ہی گئے ہیں، گھر اندر باہر بھرا پڑا ہے، اپنے بھی بیگانے بھی، بوڑھے بھی بچے بھی، عوام بھی خواص بھی پر یہ کیا کہ ہر آنکھ میں آنسو، ہر لب پر آہ و فغاں! یہ حق والے عباسی صاحب تو بڑے ہنس مکھ، صابر و ضابط تھے۔ انھیں کیا ہو گیا کہ خود چیخ چیخ کر رو رہے ہیں اور دوسروں کو بے اختیار رُلا رہے ہیں! اور ان کے بڑے بھائی تو شاید اُن سے بھی بڑھ کر خوش مزاج تھے اور کہیں باہر بہت دور رہا کرتے تھے، یک بیک کیسے آ گئے۔ روتے

منقول از صدق، ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء
~~~~~~

جاتے ہیں اور شاید زیرِ لب کچھ پڑھتے بھی جاتے ہیں! یہ گھر کی بڑی بڑی عفیف پردہ نشین بیو یاں، ان کی تو آواز تک کا پردہ تھا یہ ہے کیا کہ بے اختیار سب باہر کی طرف ٹوٹی پڑتی ہیں۔ ساری رات بکی تخت رو رو کر کاٹی ہے، کل دن ہی سے رو رہی ہیں، جمعرات کی دوپہر سے جمعہ کی صبح کا وقت آگیا، مسلسل اور بے ساختہ ایک عالم رونے پیٹنے کا ہے! کسی نے اس مدت میں کھانے پینے کا نام اس گھر میں جانا ہے! ـــــ سامنے دیکھیے زنڈیوانخانہ میں اجلی شفاف چادروں میں لپٹی ہوئی، تازی نہائی دھوئی ہوئی کافور اور عطر کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی گھر بھر کی مینا، بیٹی نوشابہ پلنگڑی پر لیٹی ہوئی ہے! ـــــ اچھا تو یہ جشنِ نوشابہ ہے وہ پڑنا جشنِ مسرت نہیں، مجلسِ ماتم، نوحۂ غم اور نغمۂ مسرت کے درمیان فرق ہی کیا ہے۔؟

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ـــــ ✻ ـــــ

سنا تھا کہ ماں باپ کو اپنی اس گڑیا کی شادی رچانے کا بڑا ارمان ہے، ارمان کیسے نہیں ہوتا؟ یہاں تو اولاد کے داغ پر داغ اٹھانے کے بعد سات آٹھ اولادوں کو خاک میں سلانے کے بعد یہی ایک زندہ سلامت بچی تھی۔ سات لڑکوں سے بڑھ کر یہ ایک لڑکی عزیز، ماں، باپ کی آنکھوں کا تارا! گھر بھر کی امیدوں کا مرکز! لڑکا بھی گھر ہی میں سے کہیں لینے جانا نہیں، بھائی ہی کی اولاد بھی اپنی ہی اولاد ہوتی ہے تو کہیں لڑکی کی رخصتی ہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ بارہ برس کا سن شادی کا سن تو نہیں ہوتا لیکن عجب کیا جو ارمان کے مارے موئے ماں باپ نے اسی سن میں شادی اور رخصتی کی ٹھہرالی ہو! ـــــ بے شک نوشابہ آج رخصت ہو رہی ہے، ہاتھ پر سیاہ رنگ کی لاری بھی لگی ہوئی ہے، رخصت وہاں کے لئے ہو رہی ہے جہاں جا کر پھر کوئی واپس نہیں آتا، معصوم نے کل ہی اپنی بہنوں سہیلیوں سے کہا بھی تو تھا کہ اب ہم اپنے گھر جا رہے ہیں، ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ وہ دیکھو سفید موٹر کھڑی ہے

ہوئے ہیں "۔۔۔۔۔۔ بچوں کا انکشاف بہت قوی ہوتا ہے عجب کیا جو برزخ کا انکشاف قبل سے ہو گیا ۔۔۔ تو کیا، وہ ہنستی کھیلتی بھولی بھالی ، نیک سیرت و قبول صورت ، محلہ کے غریبوں کو پیسے بانٹنے والی ، پڑوسیوں کے دل میں جگہ رکھنے والی لڑکی دنیا سے رخصت ہو ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ؟ کل دوپہر کو اسی طرح کا فقرہ حسرت نصیب باپ کی زبان سے سنا بھی تو تھا. کسی آنے والے عزیز کو خبر دے رہے تھے. بی بلائی ، ۱۲ برس کی اکلوتی کے لئے "موت" کا لفظ ان کی زبان سے نکلا کیونکر تلفظ ادا کرنے پر قدرت ہی زبان کو کیسے رہی ؟

اور پردہ نشین غمزدہ ماں ! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہے بحض سکتہ کا عالم طاری ہے بیشک آنسو سلب ہو گئے ہوں گے لیکن کلیجہ کی پھڑپھڑن کو کیا کر رہی ہوں گی ؟ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینہ میں اٹھتی ہو گی اس کا کیا علاج ہے ؟ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں ، آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ، ہوئے اجڑتے ہوئے خود زندہ کیسے رہیں ؟ ہوش و حواس پر قابو رکھنے کی قوت و توانائی کس نے دیدی ؟ کڑے کڑے امتحان مالک و مولیٰ کے دربار میں پیغمبروں اور خاص خاص برگزیدہ بندوں کے ہوا کرتے ہیں ، کیا ان عاجز و ناتواں بندوں بندیوں کو بھی اسی مرتبہ پر پہونچانا منظور ہے ؟

در و دیوار بھی مرشد آباد ہاؤس کے اگر اس وقت رو رہے ہیں تو حیرت نہ کیجئے اس سے بڑھ کر پراثر و درد انگیز منظر اس نے دیکھا کب ہو گا ؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں   اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو   سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

" سوئے مدفن " یہاں کیسے لئے جا رہے ہیں ! لڑکی کے دن یہ کھیلنے کھانے کے تھے ، دوڑنے پھرنے کے تھے ، گڑیا گڈے کے بیاہ رچانے کے تھے یا " سوئے مدفن " لیجانے کے تھے ؟ لیکن شور و شیون کے ہنگامہ میں ذرا کان لگا کر سنیئے تو غسل دینے والیوں کا بیان ہے کہ غسل والی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ، عجب نہیں جو ہنس ہنس کر کچھ کہہ بھی رہی ہو ، دل کے کانوں سے سنیئے ، جدا

کچھ اس طرح کی آرہی ہے: میری امّی! یہ آپ کا رونا بلکنا سب آپ کے حق میں رحمت ہو رہا ہے
دنیا سے معصوم جا رہی ہوں پھر آج جمعہ کا دن —— انوار اور رحمتوں کی وہ بارش کہ میں
خود اس میں گم ہوئی جا رہی ہوں —— اپنے پیارے ابّو کو دیکھ رہی تھی، کیسا دھڑا
دھڑ روپیہ میرے دوا علاج میں صرف کر رہے تھے، جیسے کہیں کے امیر کبیر ہیں! آخر میرے
بھی تو جوڑ جوڑ کر رکھنے والے تھے، میرے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ امانت اپنے مولا کو
کو واپس پہونچ گئی۔ یہ جدائی کے دن، دن ہی کتنے ہیں۔ اپنے اُن آقا سردار کی یاد میں کاٹ
دیجئے، جنھوں نے اپنی ایک نہیں دو دو اور کنواری نہیں بیاہی ہوئی جوان صاحبزادیوں
کو کفنایا، دفنایا، اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا، مٹی میں سُلایا: اپنے مالک و مولیٰ کی سپردگی میں
دیا۔ آپ کو تو انھیں کی کنیزی پر فخر ہے، انھیں سے سبق صبر کا بھی لیجئے، میرے لئے زیادہ نہ
کڑھیے یہ چند روزہ پردہ اور حجاب تو آپ ہی کی مصلحت کے لئے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں
کی بخشش کا ذریعہ اور حیلہ بن رہی ہوں، دنیا میں تو آپ کی خدمت کر ہی کیا سکتی تھی:
آپ کی شفقتوں کا بدلہ کسی درجہ میں بھی کہاں دے سکتی تھی۔ یہاں البتہ انشاء اللہ حوض کوثر
پر آپ سے ملوں گی۔ بڑھ کر اور لپک کر آپ سے لپٹوں گی۔ مچلوں گی۔ آپ دونوں کی انگلی
پکڑ کر جنت میں لے چلوں گی۔ یہ وعدے سچّے کی زبان سے آپ کو پہونچ چکے ہیں، اور سچّے
کے وعدے غلط نہیں ہوتے۔"

———

ایک قوالؒ

●
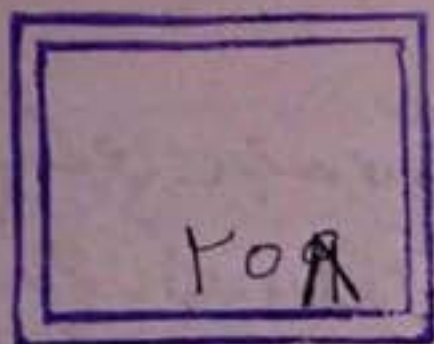
دریاباد ۳ ؍ فروری سنہ ۱۹۳۶ء دوپہر میت کو دفن کئے ابھی چلا آرہا ہوں۔ کل دن میں جا کر نزع کی حالت میں آب زمزم بھی تو پلایا تھا۔ مرنے والے کا نام افضل حسین تھا۔ عمر ستر سے کچھ اوپر۔ پیشہ "یا" ذات "کے لحاظ سے قوال تھے ——— قوال کا ذکر اور پھر صدق کے صفحات میں! — جی ہاں صدق، عالموں، زاہدوں، عابدوں کا پرچہ کب ہے؟ نامۂ سیاہ صدق لکھنیا تو خود ہی ایک عامی اور عاصی ہے؟ اپنے ہم جنسوں کا ذکر جگہ جگہ کیا کرتا ہے ——— ہاں تو اپنی جوانی کے زمانہ میں نامور قوالوں میں تھے، ردولی کی چوکی کا شمار چوٹی کی چوکیوں میں تھا۔ آواز میں ایک خاص گداز، درد و اثر تھا۔ اب مدت سے نماز اور تلاوت کے شدت سے پابند تھے۔ نماز بڑے اہتمام سے اور دل لگا کر پڑھتے۔ قرآن مجید کے کئی ایک پارے اس سن میں حفظ کر لئے تھے۔ لکھنؤ میں کچھ دن جم کر رہنے کا موقع ملا۔ تو مدرسہ فرقانیہ والوں کے پاس بیٹھ کر کچھ تجوید بھی حاصل کر لی تھی۔ اذان بڑے شوق کے ساتھ اور موثر لہجہ میں دیا کرتے۔ بڑے پرانے ہم نشین تھے۔ روزانہ سہ پہر کو آتے۔ بیٹھنے کا معمول ۴-۵ سال

صدق سنہ ۱۹۳۶ء

سے تھا مصاحبت اور علم مجلس کا سلیقہ تھا۔ جب ہمیشہ میں تھے بار ہا دل کو گرمایا تھا ــــــ اسی راقم آثم نے برسوں سماع سنا ہے ــــــ محفل کے باہر جتنا اپنے لطیفوں سے ہنساتے تھے محفل کے اندر اسی قدر اپنے پُر درد ترنم سے رُلاتے تھے۔ نزع کے وقت جب قبلہ رخ چہرہ کر دیا گیا تھا اور زیر لب اللہ اللہ جاری تھا۔ تو عبرت کی آنکھ روئی اور زبان نے دیکھنے والوں سے کہا یہ وہی شگفتہ چہرہ ہے جو گھنٹوں ہنستا ہنساتا رہتا تھا ــــــ زندگی کا آغاز تمام تر فسق کی غفلتوں سے ہوا اور خاتمہ رسولؐ کی محبت اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دل میں آخری ارمان حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا تھا ــــــ صحبت و رفاقت کا حق بڑا حق ہوتا ہے۔ نماز جنازہ پڑھانے جب ایک آوارہ و ناکارہ کھڑا ہوا تو آمرزگار کے حضور میں دعا دل سے یہ نکلی کہ اے مغفرت و رحمت پر حریص مالک و مولیٰ تیرے دربار میں ایک بوڑھا نمازی حاضر ہو رہا ہے۔

~~~~~~~~

~~~~~~~~
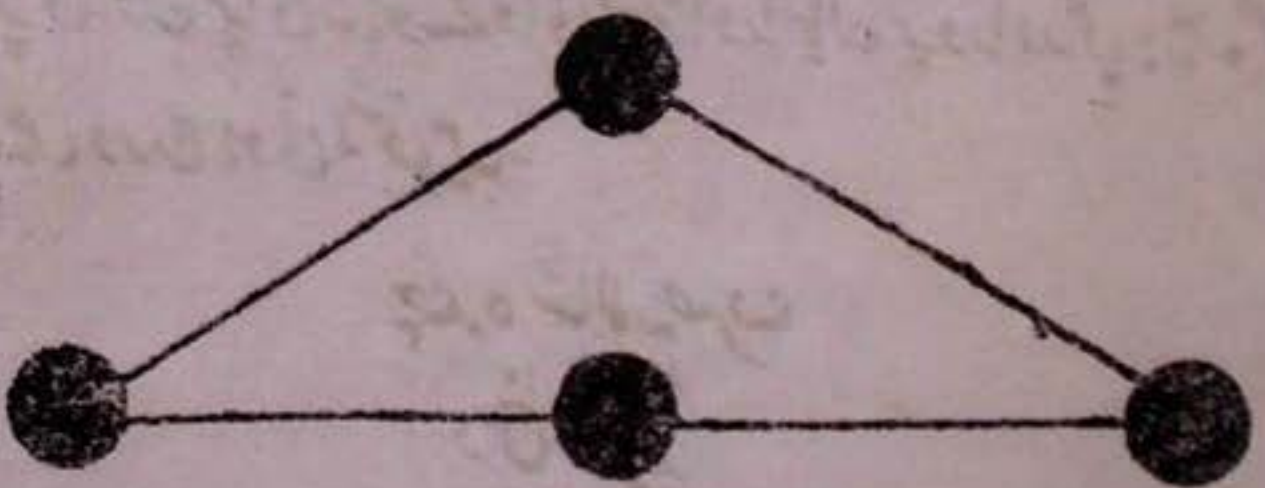
اخبار صدق جدید لکھنؤ

اردو کا یہ مشہور ہفتہ دار مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی ادارت میں تقریباً ۵۰ سال پابندی سے نکلتا رہا ہے اور اپنی دینی و علمی خدمت سیاسی جرأت و ملّی حمیت کے لئے ممتاز مانا جاتا رہا ہے۔

ساتھ ہی اس کی ادبیت بھی جاذب نظر رہی ہے۔ مولانا کی وفات کے بعد اُن کے بھتیجے حکیم عبدالقوی دریابادی کی ادارت میں اسی شان سے نکل آرہا ہے۔

مولانا دریابادی مرحوم کے افادات تفسیری (جو تقریباً بند ہیں،) اور پرانی لیکن پرانی نہ ہونے والی مؤثر اداریاں پر اور دوسری باتیں بھی اس میں درج ہوتی رہتی ہیں۔

چندہ سالانہ صرف

دس روپیہ

پتہ

منیجر صدق جدید کچہری روڈ لکھنؤ